صفر المظفر ۱۴۴۴ھ
ستمبر ۲۰۲۲ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- مسئلہ سُود اور وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ
- اِحیائی مساعی اور تنظیم اسلامی کا محل و مقام
- مساجد: روحانی و فکری راہنمائی کے مراکز

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نادر موقع

جاری کردہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

رجوع الی القرآن کورس

(دورانیہ ۹ ماہ)

عرصہ 40 سال سے باقاعدگی سے جاری تعلیمی سلسلہ

مضامینِ تدریس

پارٹ ۱ (سالِ اوّل) برائے مرد وخواتین

- تجوید و ناظرہ
- عربی گرامر (صرف ونحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری ولُغوی توضیحات)
- دورۂ ترجمہ قرآن
- قرآن حکیم کی فکری وعملی رہنمائی
- سیرت وشمائل النبی ﷺ
- مطالعۂ حدیث واصطلاحاتِ حدیث
- فکرِ اقبال
- فقہ العبادات
- معاشیاتِ اسلام
- اضافی محاضرات

پارٹ ۲ (سالِ دوم) برائے مرد حضرات

- عربی زبان وادب
- اصولِ تفسیر
- تفسیر القرآن
- اصولِ حدیث
- درسِ حدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- عقیدہ (طحاویہ)
- اضافی محاضرات

☆ رجسٹریشن جاری ہے ☆ انٹرویو یکم ستمبر
آغاز 5 ستمبر 2022ء (اِن شاءاللہ)

ایامِ تدریس: پیر تا جمعہ

نوٹ: بیرونِ لاہور رہائشی حضرات کے لیے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔
لہٰذا خواہشمند حضرات پہلے سے اپنی رجسٹریشن کروالیں۔

اوقاتِ تدریس:
صبح 8 بجے تا 12:30

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی خدماتِ قرآنی کا مرکز —— قرآن اکیڈمی

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
email:irts@tanzeem.org
www.tanzeem.org

زیر انتظام: مرکزی انجمن خدام القرآن (رجسٹرڈ) لاہور ——
مزید تفصیلات کے لئے www.tanzeem.org
03161466611 - 04235869501-3

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد	:	71
شمارہ	:	9
صفر المظفّر		1444ھ
ستمبر		2022ء
فی شمارہ	:	40روپے

سالانہ زرِتعاون: 400روپے

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلسِ ادارت:
ایوب بیگ مرزا' خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:
حافظ محمد زاہد' محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700' فون: 3-35869501
فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org
ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321
publications@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: (042)35473375-78
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ——— 5
مسئلۂ سود اور وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ — ادارہ

بیانُ القُرآن ——— 9
سورۃ الطَّلَاق — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دعوت و تحریک ——— 26
احیائی مساعی اور تنظیم اسلامی کا محل و مقام — خورشید انجم

دعوت و عزیمت ——— 41
دورِ حاضر کے فرعونوں کا مقابلہ —— کیسے؟ — انجینئر محمد رشید عمر

مطالعہ حدیث ——— 45
چالیس احادیث — شاہ ولی اللہ دہلویؒ

اسلامی طرزِ زندگی ——— 59
مساجد — روحانی وفکری رہنمائی کے مراکز — احمد علی محمودی

انوارِ ہدایت ——— 78
فکرِ آخرت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسئلۂ سود اور وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ

فیڈرل کورٹ کے ''ربا'' کے خلاف حالیہ فیصلے کے پس منظر میں سابقہ تین عدالتی فیصلے اور ۲۰۱۳ء سے جاری حالیہ عدالتی کارروائی کی ۵۸ سماعتوں کی طویل تاریخ کارفرما ہے۔ حالیہ فیصلے میں بیان کردہ ربا کی مذکورہ بالا وضاحت سے ربا کی وہ تمام شکلیں ممنوع و منسوخ قرار دی جاچکی ہیں جو سودی نظام کی بنیادی تشکیل کا ذریعہ ہیں۔ ان میں ربا النسیئہ‘ جو ربا القرآن بھی کہلاتا ہے‘ کی تمام ممکنہ شکلیں بیان ہوگئیں۔ اسی طرح ربا الفضل‘ جسے ربا السُنّۃ بھی کہا جاتا ہے‘ کو بھی پہلے سے زیادہ صراحت کے ساتھ ممنوع و منسوخ قرار دیا گیا ہے۔ عدالت کی جانب سے یہ صراحت اور وضاحت آنے کے بعد اب یہ بحث ہر دور کے لیے ختم ہوچکی کہ یہ جو ماڈرن کمرشل انٹرسٹ ہے یہ ربا ہے یا نہیں ہے۔ اور جو ساتویں صدی عیسوی کا ربا تھا اس میں اور موجودہ اکیسویں صدی کے کمرشل انٹرسٹ میں کوئی فرق ہے یا نہیں ہے۔

جن آٹھ بینکوں نے اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی تھی انہوں نے اپیل واپس لے لی ہے مگر فائن ٹون کرنے کے بعد دوبارہ سپریم کورٹ میں جانا چاہتے ہیں اور سٹیٹ بینک نے تو ریویو کے لیے پٹیشن دائر کر رکھی ہے۔ حکومت کی طرف سے وزیر اعظم اور وزیر خزانہ نے کہا ہے کہ ہم اس فیصلے کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ہم کوشش کریں گے کہ اس کی روح کے مطابق عمل کیا جاسکے۔ پھر ایک ٹاسک فورس بنادی گئی ہے جس میں مفتی محمد تقی عثمانی سمیت مختلف علماء کرام اور حکومتی ذمہ داران شامل ہیں۔ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اگر حکومت وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے پر عمل درآمد کرانے کے لیے ٹاسک فورس بنا رہی ہے تو سٹیٹ بینک اپنی پٹیشن واپس کیوں نہیں لیتا؟ اس پٹیشن کا سپریم کورٹ میں جانا یہ واضح کر رہا ہے کہ نیک نیتی نہیں ہے۔ اگر آپ کو فیصلے کے حوالے سے کوئی وضاحت یا تشریح چاہیے تو آپ وفاقی شرعی عدالت میں جائیں تاکہ وہیں پر معاملہ حل ہو۔ سپریم کورٹ میں جانے

کا مطلب یہ ہوگا وہ فیصلہ stay کا شکار ہو جائے گا۔ اور یہی چیز ہم پچھلے پچاس برسوں سے دیکھتے آ رہے ہیں کہ مختلف حیلے بہانوں سے معاملے کو لٹکایا جا رہا ہے۔ پھر کمیشن اور ٹاسک فورس پہلے بھی بنتے رہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور سٹیٹ بینک کی کمیٹیوں نے بھی بڑے کام کیے ہیں لیکن اصل تقاضا ابھی تک پورا نہیں ہوا۔ بہرحال ہم نیک نیتی اس وقت محسوس کریں گے جب کوئی ایک قابلِ ذکر عملی قدم اٹھالیا جائے گا۔

وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ ۳۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بہت سارے کام کرنے کو دیے گئے جن میں کچھ فوری نوعیت کے ہیں جو فوری ہو سکتے ہیں۔ حکومت اگر نیک نیت ہے تو وہ پہلا کام یہی کرے کہ سٹیٹ بینک کا پٹیشن واپس لے کر دکھائے اور کسی تشریح کی ضرورت ہے تو وفاقی شرعی عدالت سے رجوع کرے۔ ہماری دوسری گزارش یہ ہے کہ ٹاسک فورس میں ان علماء کو بھی شامل کریں جو موجودہ اسلامی اکانومی اور معیشت کے میکنزم کو بھی سمجھتے ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ سٹیک ہولڈرز اور بھی ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر وہ جماعتیں اور حضرات جو پچھلے بیس سال وفاقی شرعی عدالت میں اس کیس کی سماعت کے دوران بڑے صبر آزما مراحل سے گزرے ہیں اور انہوں نے اس مقدمے کے سارے اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں‘ ان حضرات کو بھی آن بورڈ لینے کی ضرورت ہے۔

مستقبل کے حوالے سے ہمارا لائحہ عمل واضح ہے کہ جس طرح تنظیم اسلامی نے دوسری جماعتوں بالخصوص جماعت اسلامی کے ساتھ مل کر انسدادِ سود مہم میں کوششیں کیں‘ ہمارے اور جماعت اسلامی کے وکلاء نے مل کر عدالت میں کوششیں کیں اسی طرح آئندہ بھی کوشش جاری رکھیں گے اور تنظیم اسلامی اس حوالے سے ایک مہم کا آغاز ۱۹/اگست ۲۰۲۲ء سے باقاعدہ طور پر کر چکی ہے۔ کچھ اہلِ علم حضرات کی طرف سے بھی اس کوشش کو جاری رکھنے کی بات آئی ہے۔ مفتی تقی عثمانی صاحب اور مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے بھی کچھ فورمز پر بات کی ہے کہ ہمیں اس فیصلے کے نفاذ کے لیے محنت کرنے اور اس حوالے سے پریشر ڈالنے کی ضرورت ہے‘ کیونکہ یہ مسئلہ سب کے نزدیک متفقہ ہے‘ سود کی حرمت کا کوئی انکار نہیں کرتا۔

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرمایا کرتے تھے کہ شریعت کے نفاذ کا مطالبہ لے کر ہم کھڑے ہوں تو پہلے ہمیں چند منکرات کو ٹارگٹ کرنا ہوگا اور کسی متفق علیہ منکر کے خلاف مہم کی بنیاد پر نفاذِ شریعت کے مطالبے کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ بہرحال اس حوالے

سے تنظیم اسلامی عوام الناس اور علماء کرام کو آگاہ کرنے کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ مولانا زاہد الراشدی جیسے علماء بھی انسدادِ سود کے حوالے سے محنت کر رہے ہیں اور دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی دباؤ بڑھانے کی بات آ رہی ہے۔ ہم پُرامن ایجی ٹیشن کی بات کرتے ہیں۔ شریعت کے نفاذ کے لیے آخری اقدام کو ہم تحریک کہیں گے‘ اس سے پہلے ہم مہمات چلاتے ہیں۔ آگاہی منکرات مہمات کی طرح سود کے خلاف بھی ایک مہم شروع کی جا چکی ہے جو ایک مشترکہ کوشش ہو گی اور تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کے اصول کے تحت تنظیم اسلامی اپنا حصّہ ضرور ڈالے گی۔

تنظیم اسلامی اس سے پہلے بھی منکرات کے خلاف مہمات کا اہتمام کرتی رہی ہے۔ ہم پہلے پارلیمنٹ کے تمام ممبران‘ ججز‘ صحافیوں‘ ائمہ حضرات وغیرہ سب کو خطوط لکھتے ہیں۔ چونکہ ہم نے یہ ملک اسلام کے نام پر لیا ہے لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ ان تک بھی بات پہنچائی جائے۔ ہمارے پاس زورِ بازو سے منکر کو ختم کرنے کی طاقت نہیں تو زبان سے اس کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں تک دینی سیاسی جماعتوں کا تعلق ہے تو ان سے ہم دست بستہ گزارش کرتے ہیں کہ ۷۵ برس کا بہت بڑا تجربہ ہمارے سامنے ہے کہ اس انتخابی سیاست کے نتیجے میں شریعت کا نفاذ ممکن نہیں ہے‘ کیونکہ یہ فرسودہ نظام کی میوزیکل چیئر گیم ہے۔ البتہ جب دینی جماعتوں نے کسی متفق علیہ معاملے پر انتخابی سیاست سے ہٹ کر کوئی تحریک چلائی‘ مثلاً قادیانیوں کے خلاف‘ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے قانون کی تبدیلی کی کوشش کے خلاف تو اللہ تعالیٰ نے کامیابی دی۔ پھر سندھ اسمبلی میں خلافِ اسلام قانون ہو یا نام نہاد گھریلو تشدد بل ہو اس کے خلاف دینی جماعتوں نے آواز بلند کی تو ان کا پریشر قبول کیا گیا اور اللہ نے کامیابی دی۔ ہم دینی سیاسی جماعتوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ انتخابی سیاست کو چھوڑ کر انقلابی سیاست کا راستہ شریعت کے احکام کے نفاذ کے لیے اپنائیں‘ کیونکہ پاکستان میں نفاذِ شریعت کے لیے یہی صحیح تر راستہ ہے۔

اب‘ کیا آگے کے چیلنجز ہیں۔ یہ نعمتِ ہدایت اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک مرتبہ پھر اس فیصلے کے ذریعے عطا کی ہے‘ اس کی کیسے قدر کی جائے اور کون سے اقدامات اب ضروری ہوں گے۔ اس ضمن میں تین امور کی جانب توجہ ضروری ہے‘ جو اس عدالتی کیس کے اسکوپ سے باہر ہونے کی وجہ سے کورٹ کے فیصلے میں مناسب طور سے ایڈریس نہیں ہو سکے۔ سب سے پہلا فوریکس ٹریڈ اور Money Market کے امور میں ربا کی آمیزش کا معاملہ ہے۔ اس کے لیے ربا کے عمومی احکام کے علاوہ ''احکام الصرف'' کو ملحوظ رکھتے ہوئے کرنسی کے تبادلے میں مستقبل کے

سودوں کی موجودہ شکلوں اور اس کے لیے ملکی قوانین میں دی گئی provisions کا قرآن و سُنّت کی روشنی میں جائزہ از حد ضروری ہے۔ دوسرا معاملہ قیمتوں کی اشاریہ بندی (indexation) سے متعلق ہے۔ حالیہ فیصلے میں عدالت نے بوجوہ اس ایشو پر حتمی پوزیشن لینے سے گریز کیا ہے۔ اس کا جائزہ لیے بغیر طویل مدّتی مالی معاہدات میں افراطِ زر کے اثرات پر قرآن و سُنّت کی رہنمائی میں compensation کا طریقہ واضح نہیں ہو سکتا۔

تیسرا اور اہم ترین معاملہ اسلامی بینکاری کے موجودہ طریقوں اور آلاتِ تمویل کا ہے۔ حالیہ فیصلے میں پیرا نمبر ۹۰ اور ۹۱ میں کہا گیا ہے کہ غیر سودی بینکاری قابل عمل بھی ہے اور ایک حقیقت بھی ہے۔ دورانِ سماعت اسلامی بینکاری کے حوالے سے عدمِ اعتماد کا اظہار ہوا اور اس میں غیر شرعی حیلوں کی آمیزش کی طرف توجہ دلائی گئی‘ لیکن چونکہ کسی نے ان کے متعلقہ آلاتِ تمویل یا قوانین کو باضابطہ چیلنج نہیں کیا اور اس سے متعلقہ کوئی پروویژن آف لاء کے خلاف کوئی باضابطہ پٹیشن دائر شدہ نہیں ہے‘ اس لیے ہم نے اس معاملے کو کھلا رکھا ہے۔ تو اب ہم موقع دیتے ہیں کہ جس نے ان کو چیلنج کرنا ہے وہ نئی پٹیشن دائر کر سکتا ہے اور اسلامی بینکنگ میں جو حیلے اور غیر شرعی طریقے در آئے ہیں ان کو سامنے لائیں تاکہ ہم سود کی definitions کی روشنی میں یہ متعین کر سکیں کہ اس میں ہونے والے کام کس حد تک اسلامی ہیں اور مقاصد شرعیہ کو پورا کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ایک کام ہے ان لوگوں کے لیے کہ جو اسلامائیزیشن آف اکانومی کے سلسلے میں کوئی حقیقی پیش رفت کرنا چاہتے ہیں (خاص طور پر وہ حضرات جو آئے دن ''اسلامی بینکاری'' کے ''اسلامی'' ہونے پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتے رہتے ہیں‘ لیکن کسی ٹھوس تجویز کے ساتھ سامنے بھی نہیں آتے) کہ وہ ان طریقوں کو ہائی لائٹ کریں‘ ان قوانین کو چیلنج کریں کہ جن کے اندر ابھی شرعی اعتبار سے اشکالات نظر آ رہے ہیں۔ اس کام کے لیے البتہ ضروری ہو گا کہ جو فیصلہ آ چکا ہے اس پر اخلاص کے ساتھ عمل درآمد کا آغاز کیا جائے اور قانونی و عملی رکاوٹوں کو پورے عزم و ارادے سے دور کرنے کی سعی کی جائے۔ بصورتِ دیگر نہ یہ فیصلہ مؤثر العمل ہو سکے گا اور نہ ہی مملکت خداداد پاکستان کے قیام کے بنیادی فلاحی مقاصد کی طرف کوئی پیش رفت ممکن ہو سکے گی۔

[تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ''حکمتِ قرآن'' (جولائی۔ستمبر ۲۰۲۲ء) کا اداریہ
از حافظ عاطف وحید صاحب]

❀❀❀

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الطَّلَاقِ

تمہیدی کلمات

زیر مطالعہ مدنی سورتوں کے گلدستے کا آخری اور نہایت ہی حسین جوڑا سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم پر مشتمل ہے۔ ان دونوں سورتوں کی باہمی مناسبت اور مماثلت کی ایک علامت تو یہ ہے کہ دونوں کا آغاز یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ کے کلمہ سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مضمون بھی مشترک ہے۔ دونوں سورتوں میں اسلام کے معاشرتی نظام بلکہ خاص طور سے عائلی نظام سے متعلق نکات زیر بحث آئے ہیں۔ عائلی قوانین اور معاشرتی اقدار کی جزئیات وتفصیلات کو قرآن مجید میں جس اہتمام سے بیان کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ موضوع خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ سورۃ البقرۃ کے مسلسل چار رکوع اور سورۃ النساء کے متعدد مباحث اس موضوع کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ پھر سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب میں بھی اس موضوع سے متعلق تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں۔ سورۃ المجادلہ کا آغاز بھی ایک عائلی مسئلے (ظہار) سے ہوتا ہے اور پھر سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم دو مکمل سورتیں بھی اسی مضمون سے متعلق ہیں۔

میاں بیوی کا جوڑا چونکہ انسانی معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اس لیے معاشرے کو درست رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان دو افراد کے باہمی تعلقات توازن اور اعتدال کی حدود کے اندر رہیں۔ اس کی مثالی صورت تو یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی بحیثیت مسلمان ایک طرف اللہ تعالیٰ کے حقوق کما حقہ ادا کرنے والے ہوں اور دوسری طرف وہ ایک دوسرے کے ان حقوق کی ادائیگی پر بھی کمربستہ رہتے ہوں جو اسلام نے ان پر عائد کیے ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیجیے کہ مرد اور عورت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ بنیادی دینی فرائض تو ایک جیسے ہی ہیں' مثلاً نماز'

روزہ' زکوٰۃ' حج وغیرہ کی ادائیگی کا اہتمام شرعی احکام وحدود کی روشنی میں اپنی اپنی جگہ دونوں کو کرنا ہے۔ البتہ دعوت وتبلیغ کی فرضیت کے حوالے سے عورت کا دائرۂ عمل عورتوں اور محرم مَردوں تک محدود ہو جاتا ہے۔ جبکہ اقامتِ دین کی جِدّوجُہد (خصوصی طور پر جہاد وقتال) میں عورتیں حسبِ استطاعت بالواسطہ کردار ادا کرنے کی ہی مکلّف ہیں۔ مثلاً وہ اپنے بیٹوں' بھائیوں اور شوہروں کو ایسے سازگار حالات اور مواقع فراہم کر سکتی ہیں جن میں وہ اقامتِ دین کے حوالے سے اپنی ذِمّہ داریاں یکسوئی کے ساتھ ادا کر سکیں۔ بہرحال ایک مثالی اور متوازن عائلی زندگی کا نقشہ یہی ہے کہ میاں بیوی دونوں اپنے اپنے فرائض ذِمّہ داری اور خوش اسلوبی سے ادا کرنے والے ہوں۔

اس حوالے سے دوسری امکانی صورت یہ ہے کہ میاں بیوی کی طبیعتوں میں عدم موافقت کی وجہ سے گھر کے معاملات معمول کے مطابق نہ چل رہے ہوں اور حقوق وفرائض کی ادائیگی میں بھی مسلسل کوتاہی ہو رہی ہو۔ ظاہر ہے اس کی وجہ سے گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑے کا ماحول رہے گا' اور اگر یہ اختلاف بڑھتا جائے گا تو طلاق کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔ چنانچہ ایسی صورتِ حال سے متعلق مسائل سورۃ الطلاق میں بیان ہوئے ہیں (واضح رہے کہ طلاق کے مسائل اور قوانین و ضوابط کا ذکر سورۃ البقرۃ اور سورۃ النساء میں بھی آیا ہے)۔ گھریلو زندگی میں عدمِ توازن کی دوسری انتہا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی اور اہل وعیال کی اس حد تک دلجوئی کرے کہ اس میں شریعت کے احکام اور دعوت واقامتِ دین کی جِدّوجُہد کے تقاضوں کا بھی خیال نہ رہے۔ یہ موضوع سورۃ التحریم میں آئے گا۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ اگرچہ ان دونوں سورتوں میں خصوصی طور پر یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ کے الفاظ میں براہِ راست حضور ﷺ کو مخاطب کیا گیا ہے' لیکن اصل میں اس سے اُمّت کی تعلیم مقصود ہے اور اس مقصد کے لیے حضور ﷺ کو اُمّت کے معلّم کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ نکتہ سورۃ الطلاق کی پہلی آیت کے حکم سے مزید واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اس حکم کا حضور ﷺ کی ذات سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ آپؐ نے نہ تو اپنی کسی زوجہ کو طلاق دی اور نہ ہی آپؐ کو طلاق دینے کی اجازت تھی۔ اس لیے کہ سورۃ الاحزاب کی آیت ۶ میں حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو اُمّت کی مائیں قرار دیا گیا ہے اور سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۳ کے مطابق حضور ﷺ کے بعد بھی وہ کسی اور سے نکاح نہیں کر سکتی تھیں۔ لہٰذا آپؐ کا اپنی ازواج

مطہراتؓ میں سے کسی کو طلاق دینے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اسی لیے سورۃ الاحزاب ہی کی آیت ۵۰ میں آپؐ کو چار ازواج کے بعد مزید نکاح کرنے کی خصوصی اجازت مرحمت فرمائی گئی۔
ان دونوں سورتوں پر میرے مفصل لیکچرز کی ریکارڈنگ دستیاب ہے۔ مزید تفصیل جاننے کے خواہش مند خواتین وحضرات اس ریکارڈنگ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

آیات ا تا ۷

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحۡصُوا
الۡعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمۡ ۚ لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُيُوۡتِهِنَّ وَلَا
يَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ وَ
مَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ لَا تَدۡرِىۡ لَعَلَّ اللّٰهَ
يُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا ۝۱ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ
بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ وَّاَشۡهِدُوۡا ذَوَىۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ وَ
اَقِيۡمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمۡ يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ
الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۬ؕ وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ۝۲ وَّ يَرۡزُقۡهُ
مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ ؕ وَمَنۡ يَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسۡبُهٗ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ بَالِغُ اَمۡرِهٖ ؕ قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَىۡءٍ قَدۡرًا ۝۳ وَالّٰٓـىِٴۡ يَئِسۡنَ
مِنَ الۡمَحِيۡضِ مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشۡهُرٍ ۙ
وَّالّٰٓـىِٴۡ لَمۡ يَحِضۡنَ ؕ وَاُولَاتُ الۡاَحۡمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنۡ يَّضَعۡنَ
حَمۡلَهُنَّ ؕ وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مِنۡ اَمۡرِهٖ يُسۡرًا ۝۴ ذٰلِكَ
اَمۡرُ اللّٰهِ اَنۡزَلَهٗۤ اِلَيۡكُمۡ ؕ وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرۡ عَنۡهُ سَيِّاٰتِهٖ وَ
يُعۡظِمۡ لَهٗۤ اَجۡرًا ۝۵ اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ وَ
لَا تُضَآرُّوۡهُنَّ لِتُضَيِّقُوۡا عَلَيۡهِنَّ ؕ وَاِنۡ كُنَّ اُولَاتِ حَمۡلٍ

فَاَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِنَّ حَتّٰى يَضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ ۚ فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَكُمۡ
فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ ۚ وَاۡتَمِرُوۡا بَيۡنَكُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ ۚ وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ
فَسَتُرۡضِعُ لَهٗۤ اُخۡرٰى ؕ ۝۶ لِيُنۡفِقۡ ذُوۡ سَعَةٍ مِّنۡ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنۡ
قُدِرَ عَلَيۡهِ رِزۡقُهٗ فَلۡيُنۡفِقۡ مِمَّاۤ اٰتٰٮهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا
اِلَّا مَاۤ اٰتٰٮهَا ؕ سَيَجۡعَلُ اللّٰهُ بَعۡدَ عُسۡرٍ يُّسۡرًا ۝۷

آیت ۱ ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحۡصُوا الۡعِدَّةَ ۚ﴾ ”اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم!) جب آپ لوگ اپنی عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے حساب سے طلاق دو اور عدت کا پورا لحاظ رکھو۔“

نوٹ کیجیے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صیغہ واحد میں مخاطب کرنے کے بعد فوراً جمع کا صیغہ (طَلَّقۡتُمۡ) آ گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نہیں، عام اہلِ ایمان سے متعلق ہے اور آپؐ کو اہلِ ایمان کے نمائندہ، معلّم اور ہادی کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے۔ عدت کے حساب سے طلاق دینے اور عدت کا لحاظ رکھنے کے بہت سے پہلو ہیں۔ مجموعی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نازک اور حساس معاملے میں شریعت کی طے کردہ حدود و قیود کا لحاظ رکھو اور متعلقہ قوانین کی سختی سے پابندی کرو۔ مثلاً حیض کی حالت میں طلاق نہ دو، تینوں طلاقیں اکٹھی نہ دو، ہر طلاق کی عدت کا حساب رکھو، عدت کے دوران عورت کا نکاح نہ کرو۔ میاں بیوی کے درمیان ایک یا دو طلاقوں کے بعد ہونے والی علیحدگی کی صورت میں ان دونوں کے آپس میں دوبارہ نکاح کے حق کو تسلیم کرو وغیرہ وغیرہ۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمۡ ۚ﴾ ”اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جو تمہارا ربّ ہے۔“

﴿لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُيُوۡتِهِنَّ﴾ ”انہیں مت نکال باہر کرو ان کے گھروں سے“

ایسا نہ ہو کہ غصے میں طلاق دی اور کہا کہ نکل جاؤ میرے گھر سے، ابھی اور اسی وقت! یہ طریقہ قطعاً غلط ہے۔

﴿وَلَا يَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ﴾ ”اور وہ خود بھی نہ نکلیں سوائے اس کے کہ وہ ارتکاب کریں کسی کھلی بے حیائی کا۔“

عام حالات میں تو طلاق کے فوراً بعد عورت کو گھر سے نہیں نکالا جا سکتا، اور نہ ہی اسے از خود

نکلنے کی اجازت ہے۔ لیکن اس دوران اگر وہ بدکاری وغیرہ میں ملوث ہو جائے تو ایسی صورت میں اسے اس گھر سے نکالا جا سکتا ہے۔

﴿وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’اور یہ اللہ کی حدود ہیں۔‘‘

﴿وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ﴾ ’’اور جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا تو اُس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا۔‘‘

﴿لَا تَدۡرِىۡ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا ①﴾ ’’تمہیں نہیں معلوم کہ شاید اس کے بعد اللہ کوئی نئی صورت پیدا کر دے۔‘‘

طلاق کے بعد اگر عورت شوہر کے گھر میں ہی عدت گزار رہی ہو تو حالات بہتر ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ کیا معلوم اللہ تعالیٰ ان دونوں میں بہتری کی کوئی صورت پیدا کر دے اور وہ پہلی طلاق کے بعد ہی رجوع کر لیں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی مشیت سے حالات ہمیشہ کے لیے سازگار ہو جائیں۔

آیت ② ﴿فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ﴾ ’’پھر جب وہ اپنی (عدت کی) میعاد کو پہنچنے لگیں تو اب ان کو یا تو (اپنے نکاح میں) روک رکھو معروف طریقے سے‘ یا جدا کر دو معروف طریقے سے۔‘‘

یعنی ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں عدت پوری ہو جانے سے پہلے مرد کو حتمی فیصلہ کرنا ہو گا۔ اگر تو وہ رجوع کرنا چاہتا ہے تو شریعت کے طے کردہ طریقے سے رجوع کر لے اور اگر اس نے طلاق ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر بھلے طریقے سے عورت کو گھر سے رخصت کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اسے ستانے کی غرض سے روکے رکھے۔

﴿وَّاَشۡهِدُوۡا ذَوَىۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ﴾ ’’اور اپنے میں سے دو معتبر اشخاص کو گواہ بنا لو‘‘

یعنی اگر کوئی طلاق کے بعد رجوع کرنا چاہے تو وہ اپنے لوگوں میں سے کم از کم دو معتبر اشخاص کی موجودگی میں ایسا کرے۔

﴿وَاَقِيۡمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ﴾ ’’اور گواہی قائم کرو اللہ کے لیے۔‘‘

﴿ذٰلِكُمۡ يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ﴾ ’’یہ ہے جس کی نصیحت کی جا رہی ہے ہر اُس شخص کو کہ جو ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور یومِ آخر پر۔‘‘

اس سے ملتے جلتے الفاظ سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۱ میں حضور ﷺ کے اُسوہ اور سورۃ الممتحنہ کی آیت ۶ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپؑ کے ساتھیوں کے اُسوہ کے بارے میں بھی آئے ہیں۔ مطلب یہ کہ حضور ﷺ کا اُسوۂ کاملہ تو اپنی جگہ پر موجود ہے‘ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ اور آپؑ کے ساتھیوں کی زندگی بھی مثالی نمونہ ہے‘ لیکن کس کے لیے؟ ﴿لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ﴾ یعنی حضور ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُسوۂ حسنہ سے استفادہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور یومِ آخرت کی حاضری کی امید رکھتا ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے اس جملے کا مفہوم بھی یہی ہے کہ مسائلِ طلاق سے متعلق یہ وعظ اور نصیحت صرف اسی شخص کے لیے فائدہ مند ہو سکتی ہے جو واقعی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔

﴿وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ②﴾ ’’اور جو شخص اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا‘ اللہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا۔‘‘

اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کا مقام و مرتبہ واضح کرنے کا یہ بہت حسین اور دلکش انداز ہے اور اس اعتبار سے یہ قرآن مجید کا منفرد مقام ہے۔ یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ سمجھ لیں کہ حقیقی تقویٰ دل کا تقویٰ ہے‘ جس کے بارے میں حضور ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے دستِ مبارک سے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ((اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا، اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا، اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا))[1] کہ اصل تقویٰ یہاں (دل کے اندر) ہوتا ہے۔ آپؐ نے یہ بات تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کا براہِ راست تعلق انسان کے دل کے ساتھ ہے۔ اگر دل میں تقویٰ نہیں تو جُبّہ و دستار کا اہتمام اور متقیانہ وضع قطع کی حیثیت بہروپ سے زیادہ کچھ نہیں۔ چنانچہ اس آیت میں اہلِ تقویٰ کو بہت بڑی بشارت سنائی جا رہی ہے کہ اگر کسی بندۂ مؤمن کا تقویٰ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مقبول و منظور ہوا تو اُس کے لیے مشکل سے مشکل صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور پیدا کر دیا جائے گا‘ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تو فرعون نے انہیں ساحلِ سمندر پر جا لیا۔ اب آگے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ بظاہر بچ نکلنے کا

۱۔ صحیح مسلم‘ کتاب البر والصلة والآداب‘ باب تحریم ظلم المسلم وخذله... وسنن الترمذی‘ کتاب البر والصلة والآداب‘ باب ما جاء فی شفقة المسلم علی المسلم۔

کوئی راستہ نہیں تھا‘ مگر اللہ تعالیٰ نے سمندر کو پھاڑ کر ان کے لیے راستہ پیدا کر دیا۔

اسی طرح جب حضور ﷺ غارِ ثور میں تشریف فرما تھے تو مشرکینِ مکّہ میں سے کچھ لوگ آپؐ کے کھوج میں غار کے دہانے پر پہنچ گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ حضور ﷺ! اگر ان لوگوں نے نیچے اپنے قدموں کی طرف بھی دیکھ لیا تو ہم انہیں نظر آ جائیں گے۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ۚ﴾ (التوبۃ: ۴۰) کہ آپ فکر مت کریں‘ اللہ ہمارے ساتھ ہے! اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی صورتِ حال پیدا فرما دی کہ مشرکین آپؐ کو نہ دیکھ سکے۔ حضور ﷺ کے سفرِ طائف کی مثال لیں تو بظاہر وہاں سے آپؐ خالی ہاتھ واپس آئے تھے‘ لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے مدینہ سے کھڑکی کھول دی اور ایسے حالات پیدا فرما دیے کہ آپؐ کے مدینہ تشریف لے جانے سے پہلے ہی وہاں انقلاب آ گیا۔ یہ مثالیں گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے متقی بندوں کے لیے ضرور ’’مخرج‘‘ پیدا فرماتا ہے۔ چنانچہ اقامتِ دین کی جِدّوجُہد میں مصروف اہلِ ایمان کے لیے آیت زیرِ مطالعہ کے ان الفاظ میں یہ خوشخبری ہے کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہوئے اپنی کوششیں پورے خلوص سے جاری رکھیں۔ جب اللہ تعالیٰ کو ان کوششوں کی کامیابی منظور ہو گی تو حیرت انگیز طریقے سے منزل خود چل کر ان کے سامنے آ جائے گی۔

آیت ۳ ﴿وَّیَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ ؕ﴾ ’’اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہو گا۔‘‘

اس دنیا میں رہتے ہوئے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ رزق یعنی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا ہے۔ اس لیے جب کوئی اللہ کا بندہ اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فرمانِ الٰہی: ﴿اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) کو اپنا نصب العین بنانا چاہتا ہے تو اُس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ اندیشہ بنتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کیسے پوری ہوں گی؟ چنانچہ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑی خوشخبری ہے کہ اے میرے بندو! تمہارا رازق تو مَیں ہوں اور تمہیں رزق دینے کے لیے مَیں وسائل و اسباب کا محتاج نہیں ہوں۔ تم لوگ ایمان و یقین کے ساتھ مجھ پر اعتماد کر کے دیکھو‘ میں

تمہیں وہاں سے رزق دوں گا جہاں سے تمہیں گمان بھی نہیں ہو گا۔

﴿وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَہُوَ حَسۡبُہٗ ؕ﴾ ’’اور جو کوئی اللہ پر توکّل کرتا ہے تو اُس کے لیے وہ کافی ہے۔‘‘

جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکّل کر کے اپنے معاملات اُس کے سپرد کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات و حاجات کو اپنے ذِمّہ لے لیتا ہے۔ اسی بات کو کسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے:

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما!

کہ ہمارا کارساز تو اللہ ہے‘ اور وہ ہمارے کاموں کی فکر میں مصروف ہے‘ اس لیے ہم اپنے کاموں کی فکر کے جھنجھٹ میں کیوں پڑیں! ظاہر ہے اگر ہم خود اپنے کاموں کی فکر کریں گے تو غلطیاں بھی کریں گے‘ نقصان بھی اٹھائیں گے اور ٹھوکریں بھی کھائیں گے‘ تو کیوں نہ ہم اپنے کام اُسے سونپ کر خود کو اُس کے کام (اقامتِ دین کی جِدّوجُہد) میں لگا دیں۔ اللہ تو ایسا قدردان ہے کہ اگر اس کا کوئی بندہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرتا ہے تو وہ بدلے میں اس کا مددگار بن جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ))(۲) کہ جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی کوئی ضرورت پوری کرنے میں اپنا وقت صَرف کرتا ہے تو اللہ اس کی ضرورتیں پوری کرنے میں لگ جاتا ہے۔ چنانچہ اگر اللہ کا کوئی بندہ اپنی ذاتی ترجیحات کو پس پشت ڈال کر خود کو براہِ راست اللہ تعالیٰ کے کام میں لگا دے گا تو کیا اللہ اس کے معاملات کو خراب ہونے کے لیے چھوڑ دے گا؟ ہرگز نہیں! ایسا تو دنیا میں ہم انسانوں کے ہاں بھی نہیں ہوتا‘ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس انسان میں تھوڑی سی بھی شرافت اور مروّت ہوتی ہے وہ دوسرے انسان کی وفاداری کا بدلہ ضرور چکاتا ہے۔ چنانچہ جب ایک انسان بھی دوسرے انسان کی وفاشعاری کا صلہ دینا ضروری سمجھتا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک وفاشعار اور متوکّل بندے کی کس کس انداز سے دست گیری فرمائے گا۔ یاد رکھیں! توکّل کا تعلق بندے کے ایمان سے

۲۔ صحیح البخاری‘ کتاب المظالم والغضب‘ باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمہ‘ ح:۲۴۴۲ و ۶۹۵۱۔ وصحیح مسلم‘ کتاب البر والصلۃ والآداب‘ باب تحریم الظلم‘ ح:۲۵۸۰۔

ہے۔جس قدر گہرا اور پختہ کسی کا ایمان ہوگا‘ اسی قدر مضبوط اس کا توکّل ہوگا۔آج ہمارے لیے اللہ تعالیٰ پر بھرپور توکّل کرنا اس لیے مشکل ہے کہ ہمارا ایمان کمزور ہے۔تو آیئے! ہم اپنا ایمان مضبوط کر کے اللہ پر توکّل کریں۔اپنے معاملات کی منصوبہ بندیوں کا دردِسر مول لینے کے بجائے تفویض الامر الی اللّٰہ کی حکمتِ عملی اپنائیں۔اپنے معاملات اُس کے سپرد کر دیں اور اُس کے کام کو اپنا کام سمجھ کر اُس کے لیے اپنا تن من دھن کھپا دیں! ——— ﴿وَ اُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۴۴﴾﴾ (المؤمن)

﴿اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمۡرِہٖ ؕ﴾ ’’اللہ تو یقیناً اپنا کام پورا کر کے ہی رہتا ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے تو اپنے دین کو غالب کرنا ہی ہے‘ لیکن اس عظیم الشان کام کے لیے جدّوجُہد کی سعادت وہ اپنے بندوں کے نام کرنا چاہتا ہے۔اب اس کے لیے ہر انسان کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اس منافع بخش ’’کاروبار‘‘ میں شریک ہونا چاہتا ہے یا اپنی محرومی پر قناعت کر کے بیٹھے رہنے کو پسند کرتا ہے۔جیسے حضرات ابوبکر‘ عمر‘ عثمان‘ علی‘ عبدالرحمٰن بن عوف اور ان کے ساتھی (رضی اللہ عنہم) اس جدّوجُہد میں شریک ہو کر ہمیشہ کے لیے سرخرو ہو گئے‘ جبکہ ابوجہل‘ ابولہب اور ان کے ہم نواؤں نے اس سے بے اعتنائی دکھائی اور ابدی محرومیاں اپنے نام کر لیں۔آج ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قیامِ قیامت سے پہلے پہلے اس کُرۂ ارضی پر دینِ اسلام کو غالب تو ہونا ہے اور یقیناً ہم جیسے انسانوں کی کوششوں اور قربانیوں سے ہی ہونا ہے‘ تو کیا ہم اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کو تیار ہیں یا محرومین کی صفوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟ مَیں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا تن مَن دُھن غرض سب کچھ اس جدّوجُہد میں کھپ جائے اور ہماری ہڈیاں چُورا بن کر بھی اسلام کی تعمیرِنو میں کام آ جائیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی اور خوش قسمتی ہوگی۔

﴿قَدۡ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا ﴿۳﴾﴾ ’’اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔‘‘

یہ بہت خوبصورت اور سبق آموز جملہ ہے۔غلبۂ دین کی جدّوجُہد کے تناظر میں دیکھیں تو اس کا مفہوم واضح تر ہو جاتا ہے‘ کہ اے راہِ حق کے مسافرو! تمہاری محنت اور جدّوجُہد کس کس گھاٹی سے ہوتی ہوئی کب‘ کہاں پہنچے گی اور اللہ کی مدد کب تمہارے شاملِ حال ہوگی‘ اللہ کے ہاں یہ سب کچھ طے ہے۔یقیناً اس راستے میں کامیابی کا دارومدار اللہ کی مدد پر ہے‘ لیکن اللہ کی مدد تو

تبھی آئے گی جب تم خود کو اس کا اہل ثابت کرو گے۔اس کے لیے تمہیں منہجِ نبوی ﷺ کو اپناتے ہوئے ہر اُس راستے سے گزرنا ہوگا جس راستے سے حضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین گزرے اور ہر وہ سختی برداشت کرنا ہوگی جو آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر برداشت کی۔جب ان تمام امتحانات سے سرخرو ہو کر آگے بڑھو گے تو خود کو ایک ایسے میدان میں کھڑا پاؤ گے جس کے نشیب وفراز سرزمینِ بدر کے نشیب وفراز سے ملتے جلتے ہوں گے۔اس میدان کی مخالف سمت سے اسلحہ کی جھنکار اور ’’لَا غَالِبَ لَکُمُ الۡیَوۡمَ‘‘ کے نعروں کی گونج سنائی دے رہی ہوگی‘ جبکہ اس کی فضا ملکوتی تقدس کے احساس سے معمور ہوگی۔جب تم یہ سب کچھ دیکھو اور محسوس کرو تو جان لینا کہ تمہاری جدّوجُہد کا فیصلہ کن موڑ آ پہنچا ہے۔بس اس موقع پر تم سجدے میں گر جانا اور رو رو کر دعا کرنا کہ اے اللہ! ہم نے تیرے داعی کی دعوت پر لبیک کہا! ہم تیرے پیغام کو لے کر قریہ قریہ گھومے! گلی گلی پھرے! ایک عرصہ تک ہم نے اپنی صُبحیں اور اپنی شامیں اسی فکر میں بِتا دیں! ہم نے اس راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پھلانگنے اور ہر مشکل گھاٹی کو عبور کرنے کی کوشش کی! اے اللہ! ہم نے یہ سب کچھ تیری رضا کے لیے کیا‘ اور تیری ہی توفیق اور مشیت سے کیا۔اے ہمارے پروردگار! ہمیں معلوم ہے کہ اس راستے پر چلتے ہوئے ہم کوشش‘ محنت‘ ایثار اور قربانی کا حق ادا نہیں کر سکے! لیکن ہم سے جو ہو سکا وہ ہم نے پوری دیانت داری اور اخلاص سے کیا۔پروردگار! ہم نے اپنی سالہا سال کی محنت کو آج اس میدان میں تیرے حضور پیش کر دیا ہے! اے گناہوں کو معاف کرنے والے! تُو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہماری کوتاہیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ہماری اس حقیر سی کمائی کو قبول فرما لے......!

اگر یہ دعائیں مذکورہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد مانگی جائیں گی تو ضرور قبول ہوں گی‘ تب اللہ کی مدد بھی آئے گی‘ فرشتے بھی اُتریں گے اور دنیوی کامیابی بھی نصیب ہوگی۔لیکن اگر کوئی سمجھتا ہے کہ کاروبار بھی چلتا رہے‘ معیارِ زندگی بھی برقرار رہے‘ معمولاتِ زندگی میں بھی خلل نہ پڑے‘ مال و جان بھی محفوظ رہے‘ بچوں کے کیریئرز بھی بن جائیں اور ہمارے ہی ہاتھوں سے اقامتِ دین کا ’’کارنامہ‘‘ بھی انجام پا جائے تو یہ اُس کی خوش فہمی ہے۔ایسے لوگ کسی جماعت کے اراکین کی فہرست میں نام لکھوا کر سمجھتے ہیں کہ بس انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔اس کے بعد وہ انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ کی مدد آئے گی‘ دین غالب ہو جائے گا اور اس کے

لیے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کے مستحق ٹھہریں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہی نہیں کہ کس نے کیا قربانی دی ہے‘ کس نے کتنا وقت لگایا ہے‘ کس نے کس مرحلے پر کس مہم میں کتنا حصّہ ڈالا ہے۔ نہیں! یہ کوئی اندھیر نگری نہیں! اللہ کے ہاں ہر چیز اور ہر انسان کے ہر عمل کا حساب موجود ہے! قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا اُس نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے!

اب آئندہ آیات میں پھر طلاق سے متعلق مسائل کا ذکر ہے:

آیت ۴ ﴿وَالّٰٓـِٔيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ﴾ ’’اور تمہارے ہاں کی خواتین میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں‘‘

یعنی ایسی عمر رسیدہ خواتین جن کے حیض کا سلسلہ بند ہو چکا ہو۔

﴿اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ﴾ ’’اگر تمہیں شک ہو تو اُن کی عدت تین ماہ ہوگی‘‘

ایسی خواتین کے معاملے میں چونکہ تین طہر اور تین حیض کا حساب کرنا ممکن نہیں‘ اس لیے ان کی عدت کا شمار مہینوں میں کیا جائے گا۔ چنانچہ ان کی عدت کی مدت تین ماہ ہوگی۔

﴿وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ۭ﴾ ’’اور (ان کی بھی) جن کو ابھی حیض آیا ہی نہیں۔‘‘

اگر کسی لڑکی کا کم سنی میں نکاح ہو گیا اور ابھی اسے حیض آنا شروع نہیں ہوا تھا کہ طلاق ہو گئی تو اس کی عدت بھی تین ماہ ہی شمار ہوگی۔

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۭ﴾ ’’اور حاملہ خواتین کی عدت یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔‘‘

ایسی صورت میں وضع حمل جب بھی ہو جائے گا عدت ختم ہو جائے گی‘ چاہے اس میں نو ماہ لگیں یا ایک ماہ بعد ہی وضع حمل ہو جائے —— اس کے بعد پھر سے تقویٰ کے بارے میں یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔ اس سے قبل پہلی اور دوسری آیت میں بھی تقویٰ کا ذکر آ چکا ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝۴﴾ ’’اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے وہ اُس کے کاموں میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔‘‘

جیسا کہ سورۃ الیل میں فرمایا گیا ہے: ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۸﴾ ’’تو جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا اور (اللہ کی

نافرمانی سے) پرہیز کیا‘ اور بھلائی کو سچ مانا‘ اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔‘‘

آیت ۵ ﴿ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ۭ﴾ ’’یہ اللہ کا حکم ہے جو اُس نے نازل کر دیا ہے تمہاری طرف۔‘‘

یعنی اُس حکم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ذِمّہ داری لے لی ہے کہ میرے بندوں میں سے جو کوئی میرا تقویٰ اختیار کرے گا مَیں اُس کے معاملات میں ضرور آسانیاں پیدا فرماؤں گا۔

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ﴾ ’’اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا وہ اُس کی بُرائیوں کو اس سے دُور فرما دے گا‘‘

اس حکم کا تعلق خصوصی طور پر آخرت سے ہے۔ یعنی اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والے شخص کے دنیوی معاملات میں بھی آسانیاں پیدا کر دی جائیں گی اور آخرت کے احتساب کے حوالے سے بھی اس کے نامہ اعمال کو گناہوں سے پاک کر دیا جائے گا۔

﴿وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝۵﴾ ’’اور اسے بہت بڑا اجر و ثواب عطا کرے گا۔‘‘

آیت ۶ ﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ﴾ ’’اور ان عورتوں کو وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو اپنی حیثیت کے مطابق‘‘

پہلی آیت میں واضح حکم آ چکا ہے: ﴿لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ﴾ کہ طلاق کے بعد انہیں فوری طور پر گھر سے مت نکالو اور نہ ہی وہ از خود نکلیں۔ اسی حوالے سے اس آیت میں مزید وضاحت کی جا رہی ہے کہ عدت کے دوران مطلّقہ خاتون کو بدستور ویسی ہی رہائش فراہم کی جائے جیسی کہ تمہارے اپنے استعمال میں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اُسے گھر سے تو نہ نکالو لیکن کسی ملازمہ کی کوٹھڑی میں ڈال دو۔

﴿وَلَا تُضَاۗرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۭ﴾ ’’اور انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ‘ انہیں تنگ کرنے کے لیے۔‘‘

گھر سے نکالنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حیلے بہانے سے اسے بار بار اس قدر ستایا جائے کہ وہ تنگ آ کر خود ہی گھر سے نکل جائے۔ چنانچہ بدنیتی پر مبنی یہ طریقہ استعمال کرنے سے بھی منع کر دیا گیا۔

﴿وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ﴾ ’’اور

اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ حمل سے فارغ ہو جائیں۔"

دینِ اسلام ہمدردی اور غم گساری کا دین ہے اور اس کا ایک ثبوت مندرجہ بالا حکم ہے۔ حاملہ عورت کو انتہائی نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے' اس لیے یہاں خصوصی طور پر حکم دیا گیا کہ طلاق دینے کے بعد بھی حاملہ عورت کا خیال رکھتے ہوئے اس کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتے رہو۔

﴿فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَکُمۡ فَاٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ ۚ﴾ "پھر اگر وہ تمہارے لیے (تمہارے بچّے کو) دودھ پلائیں تو انہیں ان کا معاوضہ ادا کرو۔"

﴿وَاۡتَمِرُوۡا بَیۡنَکُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ ۚ﴾ "اور آپس میں مشورہ کر لیا کرو بھلے طریقے سے۔"

یعنی دودھ پلانے کی اُجرت اور عدّت سے متعلق معاملات مناسب طور سے آپس کے مشورے سے طے کیے جانے چاہئیں۔ اگر طلاق کے بعد وہ دونوں میاں بیوی نہیں رہے تو کیا ہوا' آخر دونوں انسان تو ہیں۔ چنانچہ انہیں چاہیے کہ تمام معاملات باہمی گفت وشنید سے طے کریں اور ایک دوسرے سے ایسا رویہّ اختیار کریں جیسا کہ ایک شریف انسان کو دوسرے شریف انسان سے اختیار کرنا چاہیے۔

﴿وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ﴾ "اور اگر تم ایک دوسرے سے تنگی محسوس کرو"

مثلاً خاتون ضد میں آ کر دودھ پلانے سے انکار کر دے یا اس قدر معاوضہ مانگے جو مرد ادا نہ کر سکے' یا مرد معاوضہ دینے سے انکار کر دے' یا کسی اور طریقے سے ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرنے کی ٹھان لے:

﴿فَسَتُرۡضِعُ لَہٗۤ اُخۡرٰی ﴿۶﴾﴾ "تو پھر کوئی اور عورت اس کے لیے دودھ پلائے گی۔"

آیت ۷ ﴿لِیُنۡفِقۡ ذُوۡ سَعَۃٍ مِّنۡ سَعَتِہٖ ؕ﴾ "چاہیے کہ خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق۔"

﴿وَمَنۡ قُدِرَ عَلَیۡہِ رِزۡقُہٗ فَلۡیُنۡفِقۡ مِمَّاۤ اٰتٰىہُ اللّٰہُ ؕ﴾ "اور جس پر اس کا رزق تنگ کر دیا گیا ہے وہ خرچ کرے اس میں سے جو اللہ نے اس کو دیا ہے۔"

﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىہَا ؕ﴾ "اللہ کسی جان کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتا مگر اسی قدر جو اُس نے اسے دے رکھا ہے۔"

یعنی عدت کے دوران مطلقہ کی رہائش' حمل کے دوران اس کا نان نفقہ' رضاعت کی اجرت وغیرہ کے معیار کا انحصار مرد کی مالی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر کشادگی ہے تو مطلقہ پر بھی اسے اسی انداز سے خرچ کرنا چاہیے اور اگر تنگ دستی کی کیفیت ہے تو ظاہر ہے وہ اسی حد تک مکلّف ہے جس حد تک اس کی استطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کے حالات سے باخبر ہے۔

﴿سَیَجۡعَلُ اللّٰہُ بَعۡدَ عُسۡرٍ یُّسۡرًا ﴿۷﴾﴾ "عنقریب اللہ تنگی کے بعد آسانی بھی پیدا کر دے گا۔"

آیات ۸ تا ۱۲

وَ کَاَیِّنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ عَتَتۡ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہَا وَ رُسُلِہٖ فَحَاسَبۡنٰہَا
حِسَابًا شَدِیۡدًا ۙ وَّ عَذَّبۡنٰہَا عَذَابًا نُّکۡرًا ﴿۸﴾ فَذَاقَتۡ وَبَالَ اَمۡرِہَا
وَ کَانَ عَاقِبَۃُ اَمۡرِہَا خُسۡرًا ﴿۹﴾ اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمۡ عَذَابًا شَدِیۡدًا ۙ
فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۚۖ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ۟ قَدۡ اَنۡزَلَ اللّٰہُ
اِلَیۡکُمۡ ذِکۡرًا ﴿ۙ۱۰﴾ رَّسُوۡلًا یَّتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخۡرِجَ
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ وَ مَنۡ
یُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ وَ یَعۡمَلۡ صَالِحًا یُّدۡخِلۡہُ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا
الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ قَدۡ اَحۡسَنَ اللّٰہُ لَہٗ رِزۡقًا ﴿۱۱﴾ اَللّٰہُ
الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَہُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ
الۡاَمۡرُ بَیۡنَہُنَّ لِتَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۬ۙ وَّ اَنَّ اللّٰہَ
قَدۡ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عِلۡمًا ﴿۱۲﴾

آیت ۸ ﴿وَکَاَیِّنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ عَتَتۡ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہَا وَرُسُلِہٖ﴾ "اور کتنی ہی بستیاں ایسی ہیں جنہوں نے اپنے رب کے حکم اور اُس کے رسولوںؑ سے سرکشی کی"

﴿فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۸﴾ ’’تو ہم نے ان کا محاسبہ کیا بہت شدید محاسبہ اور ہم نے ان کو عذاب دیا بہت ہولناک عذاب۔‘‘

آیت ۹ ﴿فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا﴾ ’’تو انہوں نے اپنے معاملے کی پوری سزا بھگت لی‘‘ ﴿وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۹﴾ ’’اور ان کے کام کا انجام خسارہ ہی تھا۔‘‘

آیت ۱۰ ﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ﴾ ’’اللہ نے ان کے لیے بہت شدید عذاب تیار کر رکھا ہے‘‘

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ﴾ ’’تو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اے ہوش مندو! جو ایمان بھی لائے ہو!‘‘

نوٹ کیجیے! یہاں پھر تقویٰ کے بارے میں تاکید کی جا رہی ہے۔ قبل ازیں پہلے رکوع میں چار مرتبہ تقویٰ کا ذکر آ چکا ہے۔

﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۱۰﴾ ’’اللہ نے تمہاری طرف ذکر نازل کر دیا ہے۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ﴾ ’’(یعنی) ایک رسولؐ جو اللہ کی آیاتِ بینات تم لوگوں کو پڑھ کر سنا رہا ہے‘ تا کہ وہ نکالے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے اندھیروں سے نور کی طرف۔‘‘

یہاں وضاحت کر دی گئی کہ ذکر سے مراد اللہ کا رسولؐ اور اللہ کی کتاب (اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ) ہے۔ سورۃ البینہ میں اس موضوع کی مزید وضاحت آئی ہے۔

﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا﴾ ’’اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے‘‘

دین کے تقاضوں کا درست فہم نہ ہونے کی وجہ سے آج ہمارے ہاں ’’اعمالِ صالحہ‘‘ کا تصور بھی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اعمالِ صالحہ سے اصل مراد یہ ہے کہ ایک بندۂ مؤمن ایمان کے جملہ تقاضوں کو پورا کرے۔ مکی دور میں جبکہ ابھی شراب‘ جوا‘ سود وغیرہ کی حرمت نہیں آئی تھی اور

نماز‘ روزہ‘ جہاد و قتال وغیرہ کا حکم نہیں آیا تھا‘ اُس دَور میں اہلِ ایمان کے لیے ’’اعمالِ صالحہ‘‘ یہی تھے کہ وہ ایمان کی دعوت دیں اور اس راستے پر جو تکلیفیں اور آزمائشیں آئیں انہیں استقامت سے برداشت کریں۔ پھر مدنی دَور میں جیسے جیسے مزید احکام آتے گئے ویسے ویسے ایمان کے تقاضے بھی بڑھتے گئے اور رفتہ رفتہ نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ‘ عُشر‘ حج‘ انفاق‘ جہاد و قتال وغیرہ بھی اعمالِ صالحہ میں شامل ہو گئے۔ گویا جس وقت ایمان کا جو تقاضا ہوا اُسے پورا کرنے کا نام ’’عملِ صالح‘‘ ہے۔ آج ایک عام مسلمان جب قرآن میں ’’عملِ صالح‘‘ کی اصطلاح پڑھتا ہے تو اس سے اس کے ذہن میں صرف نماز‘ روزہ اور ذکر اذکار کا تصور ہی آتا ہے‘ جبکہ منکرات کے خلاف جِدّوجُہد اور اقامتِ دین کے لیے محنت جیسے اہم تقاضوں کو آج اعمالِ صالحہ کی فہرست سے ہی خارج کر دیا گیا ہے۔ تو جو کوئی ایمان لانے کے بعد ایمان کے تقاضوں کو بھی پورا کرے گا:

﴿يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ﴾ ’’وہ اُسے داخل کرے گا اُن باغات میں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی‘ جن میں وہ لوگ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔‘‘

﴿قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۱۱﴾ ’’اللہ نے اُس کے لیے بہت عمدہ رزق فراہم کیا ہے۔‘‘

آیت ۱۲ ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ﴾ ’’اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے ہیں اور زمین میں سے بھی انہی کی مانند۔‘‘

یہ آیت ’’آیاتِ متشابہات‘‘ میں سے ہے۔ ابھی تک انسان سات آسمانوں کی حقیقت سے بھی واقف نہیں ہو سکا۔ ’’زمین میں سے انہی کی مانند‘‘ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جتنے آسمان بنائے اتنی ہی زمینیں بھی بنائیں‘ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے اُس نے متعدد آسمان بنائے ہیں ویسے ہی متعدد زمینیں بھی بنائی ہیں۔ قرآن حکیم کے بعض مقامات پر ایسے اشارے ملتے ہیں کہ جاندار مخلوقات صرف زمین پر ہی نہیں ہیں‘ عالَم بالا میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مفسرین نے اپنے اپنے اندازوں سے اس آیت کی تفسیر کی ہے‘ لیکن اس کا قطعی مفہوم ہم ابھی نہیں جان سکتے۔ بہرحال کسی وقت اس کی حقیقت انسان پر منکشف ہو جائے گی۔

﴿يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ﴾ ’’ان کے درمیان (اللہ کا) امر نازل ہوتا ہے‘‘

اس سے مرادتدبیرِ کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ اس بارے میں مزید وضاحت سورۃ السجدۃ کی اس آیت میں ملتی ہے:

﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵﴾

’’وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف پھر وہ (اَمر) چڑھتا ہے اُس کی طرف (یہ سارا معاملہ طے پاتا ہے) ایک دن میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار برس ہے۔‘‘

گویا یہ اللہ تعالیٰ کی ہزار سالہ منصوبہ بندی سے متعلق احکام کا ذکر ہے جو زمین کی طرف ارسال کیے جاتے ہیں۔ متعلقہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ان احکام کی تنفیذ عمل میں لاتے رہتے ہیں‘ یہاں تک کہ ہزار سال کے اختتام پر یہ ’’امر‘‘ اٹھا لیا جاتا ہے اور اگلے ہزار سال کا امر نازل کر دیا جاتا ہے۔

﴿لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ﴾ ’’تاکہ تم یقین رکھو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے‘‘

اس دورۂ ترجمۂ قرآن کے دوران کئی مرتبہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں دو صفات خصوصی اہمیت کی حامل ہیں اور قرآن مجید میں ان دو صفات کی بہت تکرار ملتی ہے۔ یعنی اللہ کا عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اور بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ہونا۔ لہٰذا ان دو صفات کے بارے میں ایک بندۂ مؤمن کا مراقبہ بہت گہرا ہونا چاہیے‘ تاکہ اللہ تعالیٰ کے علم اور اختیار کے بارے میں اُس کے یقین میں کسی لمحے کوئی کمزوری نہ آنے پائے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفات کا ذکر آیا ہے۔

﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝۱۲﴾ ’’اور یہ کہ اللہ نے اپنے علم سے ہر شے کا احاطہ کیا ہوا ہے۔‘‘

پہلے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں بتایا گیا اور اب اُس کے علم کا ذکر آ گیا۔ یعنی کائنات کی کوئی چیز اُس کی قدرت سے باہر نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ ہے۔

❁❁❁

احیائی مساعی اور تنظیمِ اسلامی کا محل و مقام

خورشید انجم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

﴿مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۴۰﴾﴾ (الاحزاب)

﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾

وقال رَسُولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلَّم :

((إِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْأُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ عَامٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا)) (رواہ ابو داؤد)

سورۃ الاحزاب کی مذکورہ بالا آیت کے مطابق ختمِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کا تاج محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے سرمبارک پر رکھا گیا۔

﴿اِنَّ فَضْلَہٗ کَانَ عَلَیْکَ کَبِیْرًا ﴿۸۷﴾﴾ (بنی اسرائیل)

’’یقیناً یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے جو آپ پر ہوا ہے۔‘‘

لیکن اس ختمِ نبوت و رسالت سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی تلافی کا بھی اللہ تعالیٰ نے درج ذیل اہتمام فرما دیا ہے:

۱۔ اپنے نورِ ہدایت کا اِتمام فرما دیا:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳)

’’آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت کا اِتمام فرما دیا ہے اور تمہارے لیے مَیں نے پسند کر لیا ہے اسلام کو بحیثیت دین کے۔‘‘

اور سورۃ الصّف میں فرمایا:

﴿وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾﴾

’’اور اللہ اپنے نُور کا اِتمام فرما کر رہے گا‘ خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔‘‘

۲۔ اس وحی کامل (قرآن مجید) کی حفاظت کا خود ہی ذمہ لے لیا:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾﴾

’’یقیناً ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔‘‘

گویا اب کسی نئی وحی یا نئے نبی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں رہی۔

اب آگے یہ کام کیسے چلے گا؟ یہ ذمہ داری نبی کریم ﷺ نے اس اُمّت کے حوالے کر دی۔ یہ قرآن تو مکمل ہو گیا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے لے لیا ہے‘ اب اس کو آگے پہنچانے کی ذمہ داری اس اُمّت کے سر ہے۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان انتہائی ترغیب و تشویق کا مظہر ہے:

((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ)) (متفق علیہ)

’’تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور (دوسروں کو) سکھائیں۔‘‘

یعنی قرآن کا علم پہلے خود حاصل کریں اور پھر دوسروں کو بھی پہنچائیں۔ ساتھ ہی اللہ کے نبی ﷺ نے اس کا کم از کم نصاب بھی بتا دیا: ((بَلِّغُوْا عَنِّي وَلَوْ آیَۃً)) (رواہ البخاری) ’’پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت ہو!‘‘ یعنی اگر صرف ایک آیت بھی یاد ہے تو اس کو بھی آگے پہنچاؤ۔

اس کے ساتھ ساتھ پھر اللہ تعالیٰ کی ایک اضافی تدبیر ہے جو اُس نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت بیان فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ مجددین کا ایک عظیم سلسلہ شروع فرما دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جو بھی مَن گھڑت عقائد و خیالات‘ باطل نظریات‘ بدعات و رسومات اور توہمات دین میں در آئیں‘ ان کی بیخ کنی کر دی جائے۔ جس طرح پہلے انبیاءِ کرام علیہم السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنّت رہی ہے‘ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے جب دین میں خرابی پیدا کی اور مشرکانہ رسوم دین میں داخل کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو بھیجا‘ قوم نے انکار کر دیا تو اس پر عذاب آ گیا اور جو بچ گئے انہوں نے نئے سرے سے دین کو قائم کیا۔ کچھ عرصہ دین اپنی اصل حالت میں قائم رہا۔ پھر جب دوبارہ اخلاقی بیماریاں آ گئیں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام کو اس قوم

کی طرف بھیجا۔ اجتماعی طور پر قوم نے ان کو نہ مانا تو پھر اللہ کا عذاب آ گیا۔ نہ ماننے والے تباہ و برباد ہو گئے اور جو بچ گئے تو انہوں نے دوبارہ دین قائم کر دیا۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا‘ یہاں تک کہ ایک بار پھر شرک‘ بدعات اور خرافات دَر آئیں تو ایک ہزار سال کے فصل سے حضرت صالح علیہ السلام تشریف لائے۔ اس طرح تجدیدِ دین کا ایک سلسلہ ہمیشہ سے جاری رہا کہ جب بھی کبھی قوموں کے اندر خرابی پیدا ہوتی تو اللہ تعالیٰ انبیاء و رُسل علیہم السلام کو مبعوث فرماتا اور وہ ان کی اصلاح کا فریضہ سرانجام دیتے۔

نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ختمِ نبوت و تکمیلِ رسالت کے بعد تجدیدِ دین کا یہ سلسلہ مجدّدینِ اُمّت کی صورت میں چلتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ کے نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ میری اُمّت میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ سلسلہ مجدّدین کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ عَامٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا))

(سنن ابی داؤد)

”اللہ تعالیٰ اس اُمّت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے لوگوں کو اُٹھاتا رہے گا جو اس (اُمّت) کے لیے اس کے دین کو ازسرِنو تازہ کرتے رہیں گے۔“

یہاں سو سال سے یہ مراد نہیں ہے کہ بارہ سو سال پورے ہوئے تو تیرہ سو میں ایک نئی ہستی آ گئی‘ تیرہ سو پورے ہوئے تو چودہ سو میں ایک نیا مجدّد آ گیا‘ بلکہ علمائے اُمّت کا تقریباً اجماع ہے کہ یہ مجدّد وقتاً فوقتاً کبھی صدی کے شروع میں‘ کبھی درمیان میں‘ اور کبھی بعد میں آئیں گے۔

دوسری بات‘ یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک صدی میں کوئی ایک ہی شخص مجدد ہو گا‘ بلکہ متعدد اصحابِ ہمّت وعزیمت آتے رہیں گے اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ پہلے ہزار سال کے دوران میں سارے مجدّدین عالمِ عرب میں آئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور حضرت حسن بصریؒ سے امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ تک جتنے بھی مجدّدینِ اُمّت ہیں‘ علماء وفقہاء‘ محدّثین کرام ومفسرین کرام ہیں‘ وہ تمام کے تمام عالمِ عرب میں آئے۔ البتہ جب بنوعباس کی عیاشیاں اپنی انتہا کو پہنچ چکیں اور وہ کیفیت ہو گئی:

مَیں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل‘ طاؤس و رباب آخر!

یعنی طاؤس و رباب مقدم ہو گیا اور راگ ورنگ کی محفلیں جمنی شروع ہو گئیں۔ وہی مشاعرے ہیں‘ وہی سونے چاندی کے برتنوں میں کھایا جا رہا ہے‘ وہی قیصر و کسریٰ کے رنگ ڈھنگ شروع ہو گئے اور شمشیر وسناں سے تعلق بالکل ختم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا فتنۂ تاتار کی صورت میں ان پر برسا۔ اس کے ساتھ ہی اسلام کی علمی وروحانی وراثت سرزمین ہند کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئی۔

گیارہویں صدی ہجری

دوسرا ہزارواں سال یعنی الف ثانی جب شروع ہوا تو برصغیر میں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر حکمران تھا۔ ایک طرف تو اس کی سیاسی اور حکومتی مصلحتیں تھیں‘ دوسری طرف اس کے ساتھ مُلّا مبارک اور اس کے دو بیٹوں ابوالفضل اور فیضی جیسے انتہائی ذہین وفطین‘ مطلب پرست دانشور بھی تھے۔ فیضی نے ”سواطع الالہام“ کے نام سے بغیر نقطوں کے دو جلدوں میں قرآن کریم کی تفسیر لکھی ہے۔ کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس میں نقطہ ہو۔ ان دونوں بھائیوں نے اکبر کو پٹی پڑھائی کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا دین تو ایک ہزار سال کے لیے تھا اور اس کی مدت ختم ہو گئی ہے۔ اب چونکہ دوسرا ہزارواں سال شروع ہو رہا ہے‘ لہٰذا ایک نئے دین کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ اس نئے دین کے لیے پھر ایک نئی ہستی کی ضرورت ہے اور وہ ہستی آپ جیسے پُرشکوہ بادشاہ ہی کی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اس کو ایک نیا دین بنا کر دے دیا اور اس طرح اللہ کے دین کی جگہ ”دینِ اکبری“ نے لے لی۔ کواکب پرستی اور عقیدۂ تناسخ کے علاوہ مختلف مذاہب کا ایک ملغوبہ تیار کیا گیا۔ شراب‘ سود اور سؤر کو حلال ٹھہرا لیا گیا۔ بادشاہ کے لیے سجدۂ تعظیمی جائز قرار دے دیا گیا۔ ہندوانہ اثرات کے تحت گوشت خوری ناپسندیدہ ٹھہری۔ ”السلام علیکم“ کی جگہ ”اللہ اکبر“ کہا جانے لگا یعنی اکبر اللہ ہے اور ”وعلیکم السلام“ کی جگہ ”جل جلالہٗ“ کہا جانے لگا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو پھر اللہ تعالیٰ نے جلالِ فاروقی کو شیخ احمد سرہندیؒ کی صورت میں ظاہر کیا اور انہوں نے اس مزعومہ دین اکبری کا قلع قمع کیا۔ تین محاذوں پر شیخ مجدد نے خاص طور پر کام کیا:

۱) مقامِ نبوت کی وضاحت اور نبی اکرم ﷺ کے خاتم النّبیّین ہونے اور تا قیامِ قیامت آپ ﷺ کی نبوت ورسالت پر زور اور سُنّت کی ترویج اور بدعات کا ردّ

۲) اہلِ تصوّف کی اصلاح

۴) سب سے بنیادی کام بادشاہ‘ حکومتی عمائدین اور ارکانِ سلطنت کو راہِ راست پر لانے کی کوشش۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

حاضر ہوا مَیں شیخ مجدّد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار!
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار!
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

گیارہویں صدی ہجری میں ان کے ساتھ دوسری اہم شخصیت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ کی ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ علمِ حدیث کا پودا ہندوستان میں انہوں نے لگایا ہے۔ اس صدی میں پورے عالمِ اسلام میں ان دونوں کی ٹکر کی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی۔

بارہویں صدی ہجری

بارہویں صدی ہجری میں تدریسی‘ تصنیفی اور سیاسی خدمات انجام دینے والی نہایت اہم و جامع شخصیت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ کی ہے۔ تفسیر‘ حدیث اور فقہ کے ساتھ تاریخ‘ منطق‘ ادب‘ فلسفہ‘ تصوّف وسلوک اور تقریباً ہر میدان اور ہر فن کے اندر ان کی تصنیفات موجود ہیں اور یہ تصانیف ہی ان کی جامعیت کا مظہر ہیں۔ انہیں جدید عمرانیات کا ’’موجدِ اوّل‘‘ بھی کہا جاتا ہے اور انہوں نے فکرِ اسلامی کی تدوینِ نو کا کارنامہ بھی سرانجام دیا ہے۔ البتہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس اُمّت کا رشتہ قرآن مجید کے ساتھ جوڑ دیا اور رجوع الی القرآن کی تحریک کے ایک طویل المیعاد عمل کا آغاز شاہ ولی اللہؒ کی ذات سے شروع ہوا۔ انہوں نے اصولِ تفسیر کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ ’’الفوز الکبیر‘‘ کے نام سے تحریر کیا اور قرآن مجید کا پہلی مرتبہ مستند فارسی ترجمہ بھی انہوں نے ہی کیا۔

کہا گیا کہ قرآن کا ترجمہ‘ یہ کیسے ممکن ہے! وقت کے مذہبی پیشواؤں کے نزدیک یہ بہرحال بہت بڑی ’’گستاخی‘‘ تھی جو اس زمانے میں ہوگئی کہ ؏ ’’اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں!‘‘ اس کی پاداش میں انہیں دہلی بدر کیا گیا اور لوگ ان کو قتل کرنے کے ارادے سے

ان کے گھر پہنچ گئے‘ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں محفوظ رکھا۔ رجوع الی القرآن کے ساتھ دوسری جانب فکری محاذ پر فکّ کُلّ نظام (ہر باطل نظام کو مٹا دو!) کے نعرے کے تحت انہوں نے ایک فکری تحریک کی بنیاد بھی رکھی۔

اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو قرآن مجید کے ساتھ جوڑنے کا سلسلہ پھر آگے ان کے بیٹوں میں بھی چلا۔ ان کے ایک بیٹے شاہ رفیع الدین ؒ نے قرآن کا لفظی ترجمہ کیا‘ جبکہ دوسرے بیٹے شاہ عبدالقادر ؒ نے قرآن کا بامحاورہ ترجمہ کیا جو آج بھی ایک ریفرنس ترجمہ سمجھا جاتا ہے۔ اردو میں جتنے بھی تراجم ہوئے ہیں ان کی بنیاد اسی ترجمے کو بنایا گیا ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن ؒ نے شاہ عبدالقادرؒ کے تقریباً سو سال بعد ترجمہ کیا اور اس کے بارے میں کہا کہ اب زبان کا محاورہ تبدیل ہو گیا ہے لیکن ترجمہ وہی ہے جو شاہ عبدالقادرؒ نے کیا ہے۔

تیرہویں صدی ہجری

پھر تیرہویں صدی ہجری کے اندر ایک اور عظیم شخصیت اٹھی اور وہ ہے مجاہدِ کبیر سید احمد شہید ؒ کی۔ یوں کہہ لیجیے کہ شاہ ولی اللہؒ کی تحریک کے تسلسل کے طور پر ان کی تحریک اُٹھی اور ہندوستان میں پہلی بار خالص نبویؐ نہج پر جہاد کیا گیا۔ بقول بانی جماعتِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ:

> ’’برصغیر ہندو پاک کی پوری تاریخ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جنگیں تو بہت ہوئی ہیں لیکن حقیقی جہاد صرف ایک ہی بار ہوا ہے‘ اور یہ جہاد وہی تھا جو سیّد احمد شہیدؒ اور ان کے ساتھیوں نے کیا اور جس کا مقصدِ واحد اعلائے کلمۂ حق کے سوا کچھ نہ تھا۔‘‘

اور بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرماتے ہیں کہ:

> ’’دورِ صحابہؓ کے بعد خالص نبوی نہج پر جہاد و قتال کا نقشہ میرے مطالعے میں اگر آیا ہے تو وہ تحریکِ شہیدینؒ ہے۔ اسلامی لشکر کو دیکھ کر ایرانی لشکر کے سپہ سالار رستم کو اس کے جاسوسوں نے جو رپورٹ دی تھی کہ: هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَ فُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ (وہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار!) بالکل وہی نقشہ ہمیں یہاں پر بھی نظر آتا ہے کہ دن کو جنگی مشقیں ہیں یا میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دے رہے ہیں تو رات کو ربّ کے حضور کھڑے ہیں۔ اور اس میں ایک تجدیدی تسلسل یہ بھی ہے کہ اس معاملے میں خانوادۂ شاہ ولی اللہ کا تعاون انہیں حاصل رہا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے دو

صاحبزادوں شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ اور شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تربیت کی ہے اور شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالغنی رحمہ اللہ کے بیٹے شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ ان کے ساتھ بالکل ایک مأمور کی حیثیت سے رہے ہیں۔ حالانکہ وہ بہت جید عالم دین تھے‘ لیکن انہوں نے سیّد احمد شہید رحمہ اللہ پر اپنی تمام تر خاندانی وجاہت اور مسلّمہ علمی برتری کے باوجود ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔‘‘

چودھویں صدی ہجری

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ چودھویں صدی ہجری میں مختلف شخصیات ہیں۔ جیسے گلدستے میں مختلف اقسام کے پھول ہوتے ہیں اور ع ’’ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است!‘‘ اسی طرح کی کیفیت ہمیں چودھویں صدی ہجری میں نظر آتی ہے۔ اس صدی میں انگریزی استعمار کے آجانے کی وجہ سے تعلیم و تربیت کے دو مستقل دھارے برصغیر میں بہہ رہے تھے۔ ایک قدیم مدارس سے فیض یاب ہونے والوں کا اور دوسرا کالجز اور یونیورسٹیز سے استفادہ کرنے والوں کا۔ مدارس میں جو عظیم اور جامع شخصیت نظر آتی ہے وہ مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ کی ہے۔ اگر شاہ ولی اللہؒ کی جامعیت کا مظہر ان کی تصانیف ہیں تو شیخ الہندؒ کی جامعیت کا ظہور ان کے تلامذہ کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ان کا ہر شاگرد اپنی جگہ ایک اہم مسلّمہ شخصیت کا مالک تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی‘ مولانا شبیر احمد عثمانی‘ مفتی کفایت اللہ‘ مولانا انور شاہ کشمیری‘ مولانا اعزاز علی‘ مولانا احمد سعید (رحمہم اللہ) اور دوسرے بہت سے شاگرد اُن کی جامعیت کا مظہر ہیں۔ سیاسی طور پر انہوں نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ ’’ریشمی رومال تحریک‘‘ کا راز افشا ہونے پر ان کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ وہاں سے جب وہ واپس آئے تو ٹی بی آخری اسٹیج پر پہنچ چکی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری دور یعنی ۱۹۲۰ء میں جمعیت علماءِ ہند کے پہلے اجلاس میں انہوں نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

’’مَیں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا‘ دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے مَیں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صَرف کردوں کہ قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے...... بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے

معانی سے روشناس کرایا جائے‘ اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے‘ اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔‘‘

مفتی محمد شفیع عثمانی صاحبؒ نے ’’وحدتِ اُمت‘‘ نامی کتاب میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: ’’...... غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔‘‘ ظاہر ہے قرآن تو کہتا ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آل عمران: ۱۰۳)

’’اور اللہ کی رسّی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامو اور آپس میں تفرقہ میں مت پڑو!‘‘

لہٰذا ایک طرف عملی طور پر تو انہوں نے رجوع الی القرآن کی تحریک شروع کی اور دوسری طرف فکری سطح پر یہ تجویز پیش کی کہ ابوالکلام آزادؒ کو ’’امام الہند‘‘ مان کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے۔

کالجز اور یونیورسٹیز کے دھارے سے نکلنے والی اہم شخصیت رومیٔ ثانی‘ ترجمان القرآن‘ نابغہ عصر علامہ اقبالؒ کی ہے۔ ان کی شاعری کے مضامین میں مکمل قرآن موجزن نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار محبّتِ الٰہی اور عشقِ رسول ﷺ سے بھرے ہوئے ہیں اور انہوں نے تو پورے اعتماد کے ساتھ یہاں تک کہہ دیا کہ: ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
این خیاباں را زِ خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا!

مفہوم: ’’اے اللہ! اگر میرے دل کا آئینہ کسی خوبی سے خالی ہے اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا بھی کچھ موجود ہے تو پروردگار! قیامت کے دن مجھے رسوا اور ذلیل کر دینا اور مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاؤں کے بوسے سے بھی محروم کر دینا۔‘‘

کتنی بڑی بات ہے جو اپنے اشعار کے بارے میں علامہ اقبال کر رہے ہیں۔ اور پھر نثر میں یعنی

اپنے خطبات میں انہوں نے اعلیٰ علمی سطح پر مطالعہ قرآن کو پیش کرنے کی ایک کوشش کی ہے۔ چنانچہ علامہ نے شعر ونثر کے ذریعے قافلۂ ملّی کو بیدار کیا ہے اور نشأۃ ثانیہ اور تجدید واحیائے دین کا کام کیا ہے۔

یہ تھا دعوت رجوع الی القرآن کا کام۔ دوسری جانب فکری سطح پر بھی علّامہ اقبال نے بہت کام کیا ہے۔ یہ بات زیادہ تر عام نہیں ہے‘ لیکن برہان احمد فاروقی صاحب نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے اور سابقہ امیر تنظیم اسلامی محترم حافظ عاکف سعید صاحب ﷾ نے باقاعدہ ایک کتابچہ ’’علّامہ اقبال کی آخری خواہش‘‘ کے نام سے لکھا ہے کہ علّامہ نے علی گڑھ کالج کے بعض پروفیسروں کے ساتھ مل کر بیعت کی بنیاد پر ’’جمعیت شبّان المسلمین‘‘ کے نام سے ایک جماعت قائم کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔

چودھویں صدی ہجری کی تیسری اہم شخصیت مولانا الیاس ؒ کی ہے۔ دلی کی جنگلے والی چھوٹی سی مسجد سے تبلیغ کے عنوان سے انہوں نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ زبان میں بھی لکنت تھی‘ انتہائی منحنی اور نحیف شخص تھے‘ لیکن آج پوری دنیا کے اندر تبلیغی جماعت کی چلت پھرت انہی کی برکت سے ہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شخصیت نے دعوت رجوع الی القرآن کا آغاز ’’الہلال‘‘ اور ’’البلاغ‘‘ کے ذریعے کیا۔ ’’ترجمان القرآن‘‘ کے نام سے انہوں نے قرآن کی تفسیر لکھی اور دوسری طرف فکری سطح پر حکومتِ الٰہیہ کا تصوّر پیش کیا۔ واضح طور پر ہماری تاریخ کے اندر حکومتِ الٰہیہ کا تصوّر ابوالکلام مرحوم نے دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بیعت کی بنیاد پر حزبُ اللہ کی تاسیس بھی کی۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک انہوں نے بڑے بھرپور طریقے سے کام کیا‘ لیکن اس کے بعد اس کام کو چھوڑ کر انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو کر اپنی پوری زندگی سیاست کی نذر کر دی۔

اس کے کم وبیش دس گیارہ سال بعد پھر ایک اور شخصیت سامنے آئی‘ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی ؒ کی۔ فکری رہنمائی بہت حد تک اقبال سے حاصل کی‘ جبکہ جذبۂ تحرک ابوالکلام مرحوم سے۔ علّامہ اقبال کی دعوت پر ہی حیدر آباد دکن کی سنگلاخ زمین کو چھوڑ کر گورداسپور پنجاب کی زرخیز زمین کی طرف ہجرت کی۔ دونوں حضرات نے باہمی مشورے سے ایک مشن کے تحت ایک مثالی بستی اور دینی تحقیق وتربیت کا ادارہ قائم کرنے کا ارادہ کیا‘ جس کا نام باہمی

اتفاق سے ’’دارالاسلام‘‘ تجویز کیا گیا۔ وہی دعوت رجوع الی القرآن اب ’’تفہیم القرآن‘‘ کے نام سے سامنے آئی۔ آج پوری دنیا اس سے استفادہ کر رہی ہے۔ الاخوان المسلمون اور دوسری اسلامی تحریکوں کے لیے مولانا کے لٹریچر نے غذا کا کام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومتِ الٰہیہ کے نصب العین کے پیش نظر ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم کر کے عملی جدّوجُہد کا آغاز کیا۔

جماعت اسلامی کے انتخابی سیاست میں کود جانے کے بعد ۱۹۵۷ء میں تقریباً اسّی ارکان اس سے جدا ہوئے جن میں بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد ؒ بھی شامل تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر صاحبؒ لاہور منتقل ہوئے اور درسِ قرآن کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ یہاں ذرا توقف کر کے اس تسلسل کو ذہن میں لایئے کہ دعوت رجوع الی القرآن اور حکومتِ الٰہیہ کا نعرہ جو شاہ ولی اللہ‘ شیخ الہند‘ ابوالکلام آزاد اور سیّد مودودی ؒ نے لگایا تھا‘ اسی کو ڈاکٹر اسرار احمدؒ لے کر اُٹھے اور خدمتِ قرآنی کے سلسلے کو قائم رکھتے ہوئے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم کی‘ جس کے مقاصد درج ذیل ہیں:

۱) عربی زبان کی تعلیم وترویج

۲) قرآن مجید کے مطالعے کی عام ترغیب وتشویق

۳) علومِ قرآنی کی عمومی نشر واشاعت

۴) ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم وتربیت جو تعلیم وتعلّمِ قرآن کو اپنا مقصدِ زندگی بنالیں۔

۵) ایک ایسی ’’قرآن اکیڈمی‘‘ کا قیام جو قرآنِ حکیم کے فلسفہ وحکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے۔

اسی کے زیرِ اہتمام مطالعہ قرآن حکیم کے ایک منتخب نصاب کو بڑی تفصیل سے بیان کیا‘ جس کے ذریعے دین کے ہمہ گیر تصوّر کو واضح کیا کہ دینِ اسلام صرف عقائد‘ عبادات اور رسومات کا مجموعہ نہیں‘ بلکہ اس کی اصل حیثیت ایک کامل نظریۂ حیات اور مکمل نظامِ زندگی کی ہے‘ جبکہ دوسری طرف فرائضِ دینی کے جامع تصوّر کو واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ ایک بندۂ مؤمن سے آخرت میں کامیابی کے لیے کیا تقاضا کرتا ہے۔

اسی تحریک رجوع الی القرآن کے ضمن میں ۱۹۸۴ء (۱۴۰۴ھ) کے رمضان المبارک میں تراویح کے ہمراہ دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز کیا۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام تھا‘ بقول

حفیظ جالندھری۔

کیا پابندِ نَے نالے کو مَیں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری!

الحمد للہ‘ اللہ تعالیٰ نے اس کام کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور آج دورۂ ترجمہ قرآن تنظیم اسلامی کی ایک شناخت بن چکا ہے۔

۱۹۸۴ء میں رجوع الی القرآن کورس کا آغاز کیا گیا‘ جو پورے پاکستان کی سطح پر تقریباً تمام انجمن ہائے خدام القرآن اور دارُالاسلام مرکز تنظیم اسلامی کی سطح پر چل رہا ہے۔

دوسری جانب فکری تسلسل کے طور پر غلبہ و اقامتِ دین کے نصب العین کے پیشِ نظر ۱۹۷۵ء میں ایک اصولی‘ اسلامی‘ انقلابی جماعت ’’تنظیم اسلامی‘‘ کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت:

۱) تصوّرِ دین و مذہب کو واضح کیا۔
۲) تصوّرِ فرائضِ دینی کو واضح کیا۔
۳) اقامتِ دین کے تصوّر کو خوب اچھی طرح سے اُجاگر کیا۔
۴) انقلاب آئے گا کیسے؟ اس حوالے سے منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ خصوصاً موجودہ دور میں آخری مرحلہ میں اجتہاد کو واضح کیا اور حق و باطل کی کشمکش کی بڑے اچھے طریقے سے وضاحت کی۔
۵) بیعت کا سلسلہ جو ابوالکلام آزاد پر ختم ہو چکا تھا‘ اس کو دوبارہ سلسلۃ الذہب یعنی اسلاف سے جوڑا۔

غلبۂ اسلام اور برصغیر پاک و ہند

اب تھوڑا سا توقف کر کے غور کر لیجیے کہ کیا شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ؒ کا تعلق برصغیر پاک و ہند سے ہونا ویسے ہی اتفاقی امر ہے؟ کیا دورِ جدید کے فاتح مجددِ اعظم شاہ ولی اللہ ؒ کا ہندی نژاد ہونا بالکل اتفاقی امر ہے؟ اسی طرح تحریکِ شہیدین کے سینکڑوں مجاہدین کا خون اس ارضِ پاک بالاکوٹ میں جذب ہونا کیا بیکار و عبث ہے؟ پھر جماعت شیخ الہندؒ کی سو سالہ خدمات‘ ترجمان القرآن علامہ اقبال کا لاہور میں طویل قیام‘ مولانا مودودیؒ کا جنوبی ہند سے شمالی ہند میں آ کر آباد ہونا اور پھر ایک عظیم تحریک کو برپا کرنا‘ پھر داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار

احمدؒ کا اس عظیم علمی ورثہ کو لے کر آگے بڑھانا‘ اس فکر کے مختلف گوشوں کو قرآن و سُنّت کی روشنی میں واضح اور مبرہن کرنا‘ اسلامی انقلاب کے مختلف مراحل کو سیرتُ النبی ﷺ کی روشنی میں واضح کرنا اور نبی اکرم ﷺ کے دور کے حالات اور آج کے حالات میں مختلف پہلوؤں سے جو فرق واقع ہو چکا ہے‘ اس کی روشنی میں مسلح تصادم کے گوشہ میں اجتہاد کر کے قابلِ عمل راستہ متعین کرنا اور جماعت سازی کے منصوص‘ مسنون اور ماثور طریقے کو اختیار کرنا‘ کیا اس کی کوئی حیثیت نہیں؟ کیا یہ سب کچھ عبث اور بیکار ہے اور ویسے ہی یہ سب کچھ ہو گیا؟ ہرگز نہیں! یہ اس چیز کا مظہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے آخری غلبے کے لیے نقطۂ آغاز کے طور پر اس خطہ یعنی پاکستان اور افغانستان کو منتخب کر لیا ہے۔ چار سو سالہ احیائی مساعی کی امانت اس خطے کے پاس محفوظ ہے۔ قرآن مجید اور احادیثِ نبوی ﷺ کے صُغریٰ و کُبریٰ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ غلبہ ہو کر رہے گا‘ لیکن اس مرتبہ یہ ’’عالمی غلبہ‘‘ ہوگا۔ قرآن حکیم میں تین مرتبہ آیا ہے کہ:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾
(الصف:۹)

’’وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایتِ کاملہ اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔‘‘

اور پانچ مرتبہ اللہ تعالیٰ نے (مختلف الفاظ میں) فرمایا ہے کہ:

﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (سبا:۲۸)

’’اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر تمام بنی نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر۔‘‘

جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے کہ اسلام کا غلبہ پورے عالمِ انسانی اور کُل کُرۂ ارضی پر ہوگا۔ قرآن حکیم میں صرف اشارات ہیں‘ لیکن احادیث کے الفاظ بہت واضح ہیں۔

(۱) مسند احمد بن حنبلؒ کی روایت ہے‘ جسے حضرت نعمان بن بشیرؓ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا ، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ ، فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّرْفَعَهَا ، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا ،

فَیَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ ، ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا ، ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا جَبْرِیَّۃً ، فَتَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ ، ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَۃً عَلٰی مِنْھَاجِ النُّبُوَّۃِ)) ثُمَّ سَکَتَ

''دورِ نبوت تم میں اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا اس کو ختم کردے گا۔ پھر نبوت کی طرز پر خلافت کا دور ہوگا' پھر وہ دور رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر وہ اس کو ختم کردے گا جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت ہوگی' وہ دور بھی اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا تو ختم کردے گا۔ پھر جبر کی فرماں روائی (غلامی کی بادشاہت) ہوگی' وہ رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر وہ اس کو ختم کردے گا جب وہ اسے ختم کرنا چاہے گا۔ پھر نبوت کے طرز پر دوبارہ خلافت قائم ہوگی۔'' پھر آپ ﷺ خاموش ہوگئے۔

(۲) صحیح مسلم کی روایت ہے جس کے راوی حضرت ثوبان ؓ ہیں۔ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

((اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَأَیْتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا ، وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُھَا مَا زُوِیَ لِیْ مِنْھَا))

''اللہ تعالیٰ نے زمین کو میرے لیے سمیٹ دیا تو مَیں نے اس کے مشرق اور مغرب کو دیکھا' اور جہاں تک کی زمین میرے لیے سمیٹ دی گئی تھی وہاں تک عنقریب میری اُمّت کی سلطنت وحکومت پہنچ کر رہے گی۔''

(۳) مسند احمد بن حنبلؒ کی روایت ہے اور اس کے راوی مقداد بن الاسود ؓ ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللّٰہُ کَلِمَۃَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ اَوْذُلِّ ذَلِیْلٍ اِمَّا یُعِزُّھُمُ اللّٰہُ فَیَجْعَلُھُمْ مِنْ اَھْلِھَا اَوْیُذِلُّھُمْ فَیَدِیْنُوْنَ لَھَا))

''روئے زمین پر کوئی اینٹوں والا گھر بچے گا نہ خیمے والا' مگر اللہ تعالیٰ اس میں کلمۂ اسلام کو داخل کردیں گے۔ یہ عزت والے کی عزت کے ساتھ ہوگا یا مغلوبیت پسند کی مغلوبیت کے ساتھ۔ (اس کی تفصیل یہ ہے کہ) یا تو اللہ ان کو اس کلمہ کے ذریعے عزت دے گا تو

وہ خود اس کلمہ کے حامل بن جائیں گے یا وہ ان کو مغلوب کردے گا تو وہ اس کے مطیع اور تابع بن جائیں گے۔''

رسول اللہ ﷺ کے درج بالا اقوال کے مطابق پورے کُرۂ ارضی پر یہ غلبہ ہوکر رہے گا۔ یہ امر لازمی ہے' شُدنی ہے' حتمی ہے اور لابدی ہے۔ جو شک کرے اس کے ایمان میں شک ہے۔

اس عالمی غلبہ کا آغاز کہاں سے ہوگا' اس کے حوالے سے بھی احادیث کے اندر اشارات موجود ہیں کہ یہ اسی خطۂ ارضی یعنی پاکستان اور افغانستان کے اس حصے سے ہوگا جسے ماضی میں ''خراسان'' کہا جاتا تھا۔ ایک حدیث بایں الفاظ منقول ہے:

((یَخْرُجُ قَوْمٌ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ ، فَیُوَطِّئُوْنَ لِلْمَھْدِیِّ سُلْطَانَہٗ)) (ابن ماجہ)

''کچھ لوگ مشرق (پورب) کی جانب سے نکلیں گے جو مہدی کی حکومت کے لیے راستہ ہموار کریں گے۔''

دوسری حدیث حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((یَخْرُجُ مِنْ خُرَاسَانَ رَایَاتٌ سُوْدٌ لَا یَرُدُّھَا شَيْءٌ حَتّٰی تُنْصَبَ بِاِیْلِیَاءَ))

(رواہ الترمذی)

''خراسان سے سیاہ جھنڈے نکلیں گے' انہیں کوئی نہیں روک سکے گا یہاں تک کہ انہیں ایلیا (یعنی بیت المقدس) میں نصب کیا جائے گا۔''

خراسان سے کون سا خطہ مراد ہے؟ نبی اکرم ﷺ کے دور کا خراسان ایران کا صوبہ خراسان' پاکستان کی پشتون بیلٹ اور افغانستان کی پشتون بیلٹ پر مشتمل تھا۔ پامیر (سطح مرتفع) جسے ''دنیا کی چھت'' (roof of the world) بھی کہا جاتا ہے' اس سے پہاڑوں کے کئی سلسلے نکلتے ہیں' کوئی چین کی طرف تو کوئی تبت کی طرف ہے۔ ہندوستان کی طرف ہمالیہ اور افغانستان کی طرف کوہِ ہندوکش ہے۔ اس مثلث کا base مالاکنڈ بنتا ہے۔ اس علاقے کے حوالے سے شامی ادیب اور مؤرخ امیر شکیب ارسلان کا قول ہے کہ:

''اگر ساری دنیا میں اسلام کی نبض ڈوب جائے' کہیں بھی اس میں زندگی کے آثار اور رمق باقی نہ رہے تب بھی کوہ ہمالیہ اور کوہ ہندوکش کے درمیان کے علاقے (جن کا base مالاکنڈ کا علاقہ بنتا ہے) میں رہنے والوں کا اسلام زندہ رہے گا اور ان کا عزم جوان رہے گا۔''

احیائی مساعی میں تنظیم اسلامی کا مقام

افغانستان میں اللہ کے وفادار سپاہیوں نے بالکل نہتے اور بے سروسامان ہونے کے باوجود نصرتِ خداوندی کے زور پر عالمی دجالی قوتوں کو شکست و ہزیمت سے دوچار کیا۔لیکن یہ چارسو سالہ علمی‘ فکری اور تحریکی خزانہ اور وراثت کی امانت اس وقت پاکستان کے پاس ہے اور یہاں تنظیم اسلامی کے کاندھوں پر ہے۔ تنظیم اسلامی سے وابستہ حضرات مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اللہ نے انہیں اس عظیم مقصد کے لیے چُن لیا ہے: ﴿هُوَ اجۡتَبٰىكُمۡ﴾ ’’اُس نے تمہیں چُن لیا ہے!‘‘ یعنی شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے فریضہ کی ادائیگی کے لیے اللہ نے چن لیا ہے۔ بقول اقبال ع

اپنی خودی پہچان! او غافل افغان!

اسی مناسبت سے کہہ رہا ہوں کہ ’’اپنی خودی پہچان‘ اے رفیقِ تنظیم!‘‘

تنظیم کیا ہے؟ افراد سے مل کر تنظیم بنی ہے اور چارسو سالہ احیائی مساعی کی امانت کا بارِگراں اب ہمارے کاندھوں پر ہے۔ امانت کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا اِیمانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَه وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَه)) (سنن البیهقی)

’’جس میں امانت داری کا وصف نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس شخص میں معاہدہ کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ : إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) (رواه البخاری)

’’منافق کی علامتیں تین ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے‘ جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے‘ اور جب اس کو امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔‘‘

یہ ایک اولمپک ٹارچ ہے جو اس وقت تنظیم اسلامی کے پاس ہے۔ یہ ٹارچ مجدد الف ثانی کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی شاہ ولی اللہ تک‘ شاہ ولی اللہ سے تحریک شہیدین تک‘ تحریک شہیدین سے شیخ الہند‘ علامہ اقبال اور ابوالکلام تک‘ پھر ابوالکلام سے سیّد مودودی تک‘ سید مودودی سے بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد (رحمہ اللہ) تک اور اب تجدیدی اور احیائی مساعی کی یہ اولمپک

(باقی صفحہ 77 پر)

دورِ حاضر کے فرعونوں کا مقابلہ — کیسے؟

انجینئر محمد رشید عمر

اللہ تعالیٰ نے کُرۂ ارضی پر جلوہ افروز ہو کر بلاواسطہ بذاتِ خود موسیٰ علیہ السلام سے بات کر کے قیامت تک کے فرعونوں کا مقابلہ کرنے کی راہ واضح فرما دی۔ وسیع و عریض کائنات میں خالقِ کائنات نے کُرۂ ارضی کو یہ اعزاز بخشا کہ اس کی وادیٔ طویٰ میں جلوہ افروز ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے رو در رو اس طرح بات کی کہ سوائے حجابِ نور کے کوئی اور شے درمیان میں حائل نہ تھی۔ انہیں یہ پیغام دیا:

''بے شک مَیں اللہ ہوں‘ کوئی معبود نہیں ہے سوائے میرے‘ پس میری ہی بندگی اختیار کرو اور مجھے یاد رکھنے کے لیے نماز قائم کرو۔ اس کائنات کی بساط لپیٹنے کی گھڑی آ کر رہے گی‘ اس کے واقع ہونے کے وقت کو مَیں نے پردۂ راز میں رکھا ہے‘ تاکہ ہر شخص کو اُس کی سعی و جہد کا بدلہ دیا جائے۔ اُس دن تمہیں کامیاب ہو کر حاضر ہونے کے راستے سے کوئی ایسا شخص ہرگز نہ روک سکے جو اس کے واقع ہونے پر یقین نہیں رکھتا اور اپنی خواہشِ نفس کے پیچھے چلتا ہے۔ (اگر تم نے ایسے لوگوں کی سازشوں کا مقابلہ کر کے انہیں شکست نہ دی اور ان کی سازشوں کا شکار ہو گئے) تو سمجھو کہ تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔'' (طٰہٰ: آیات ۱۴ تا ۱۶ کی ترجمانی)

اللہ تعالیٰ نے جب سے بنی آدم کو زمین پر آباد کاری کا حکم دیا اسی گھڑی اسے دشمن سے خبردار کر دیا اور فرمایا کہ جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے وہی کامیاب واپس لوٹ سکیں گے۔ یہ کامیابی دنیا کے اندر اللہ کی بندگی میں زندگی گزارنے اور وہ قوتیں جو آخرت کو نہیں مانتیں اور دنیا کی زندگی میں مَن مانی کرنا چاہتی ہیں‘ ان کی سازشوں کا مقابلہ کر کے ان کی چالوں کو ناکام بنا کر اللہ کے قانون کے نفاذ کی جدّوجُہد کے ساتھ مشروط کی گئی ہے۔ اگر ان کی سازشوں کو کامیاب ہونے دیا گیا تو اس کا نتیجہ پوری انسانیت کی ہمیشہ کے لیے تباہی اور بربادی نکلے گا۔ اس پیغام کو نوعِ انسانی تک پہنچانے کے لیے پے در پے انبیاء و رسل علیہم السلام سے کام لیا گیا۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ اتمامِ حجت کے لیے باری تعالیٰ نے صرف انبیاء و رسلؑ

پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود کُرۂ ارضی کے میدانِ طویٰ میں جلوہ افروز ہو کر یہ پیغام موسیٰ علیہ السلام کو بلاواسطہ عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ جو کلاموں کا بادشاہ ہے‘ اس کے پیغام میں کس کمالیت کا پہلو ہے وہ کسی انسانی کلام کی مثال سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس پیغام کا ایک ایک لفظ اٹل‘ واضح اور واجب الاطاعت ہے۔ کارِ رسالت کی تفویض میں اتنی بڑی تبدیلی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات نے بلاواسطہ خود یہ کام کیا! جس بگڑے ہوئے انسان کی اصلاح کے لیے موسیٰ علیہ السلام کی ذمہ داری لگائی گئی اس کے کردار کو جان کر اس کی اہمیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کردار کے دو اوصاف کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) جو آخرت پر یقین نہیں رکھتا (۲) جو خواہشِ نفس کی پیروی کرتا ہے

ان دو اوصاف کے حامل انسان کو اگر نام دیا جائے تو فرعون بنتا ہے‘ جس کی طرف موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون علیہما السلام کو بھیجا گیا۔ گویا ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ وقت کے فرعون کی سازشوں سے بنی اسرائیل کو نجات دلائیں۔ فرعون کو وسیع و عریض ملک مصر جس کے بیچوں بیچ دریائے نیل بہتا ہے‘ پر اقتدار حاصل تھا۔ ملکی وسائل صرف اُسی کی مرضی سے استعمال ہو سکتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ''ربِّ اعلیٰ'' کہتا تھا۔ فوج کا بڑا لشکر جرار اس کے حکم پر حرکت کرتا تھا۔ جھوٹی جادوگری کی قوت اسے حاصل تھی۔ اُس دور کی ٹیکنالوجی جس سے اُس نے اہرام تعمیر کیے‘ جس کے تعمیری راز ابھی تک منکشف نہیں ہوئے‘ وہ اسے حاصل تھی۔ وہ ان تمام وسائل کو خواہشِ نفس کا تابع ہو کر استعمال کر رہا تھا۔ اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے رعایا کو گروہوں میں تقسیم کیا ہوا تھا اور بنی اسرائیل کی قوت کو کچلنے کے لیے ان کے بیٹوں کو پیدائش کے وقت ہی مروا دیتا تھا اور بچیوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ اللہ کی ذات اور آخرت کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُس کو راہِ راست پر لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی کو ذمہ داری سونپی۔ انہوں نے اللہ کا پیغام پہنچانے میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کی‘ لیکن قوت کے ساتھ مقابلہ کرنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ اتمامِ حجت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کو وہاں سے باحفاظت نکال لیا اور فرعون اور اُس کے پورے لاؤ لشکر کو اپنی خصوصی تدبیر سے دریا بُرد کر دیا۔

فرعونیت انسانی سیرت و کردار کا ایسا بگاڑ ہے کہ بعد میں آنے والی انسانیت اس کا شکار ہونے جا رہی تھی۔ اس بگاڑ کی مثال ایسے ہی ہے کہ جیسے شراب کو اُمّ الخبائث کہا جاتا ہے اسی

طرح فرعونیت اُمّ الکفر وَالفُسوق وَالاثم وَالعُدوان ہے۔فرعونیت کے تسلّط کے لیے افکار ونظریات کی تاریخ آگے بڑھی تو (یوسف سلیم چشتی مرحوم کی تحقیق کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام سے چھ سو سال قبل اور چھ سو سال بعد کے دور میں) اللہ تعالیٰ نے اپنے مصلحین کو ایسی قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا جن کی بنیاد پر انہوں نے ہر دور کی فرعونی قوتوں کا مقابلہ کیا۔ ایک عرصہ تک معجزانہ طور پر ان کی نصرت کر کے اللہ تعالیٰ نے فرعونیت کو نیچا دکھایا۔

بالآخر دنیا میں آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوتی ہے۔آپؐ کی اوّلین ذمہ داری اپنی قوم کی اصلاح تھی اور پھر پوری انسانیت کی۔آپؐ کی قوم کے مخالفین کی قیادت ابوجہل کے ہاتھ میں تھی جس کے متعلق آپؐ نے فرمایا: ''یہ اس قوم کا فرعون ہے''۔دوسری مخالف قوت مدینہ کے یہودی تھے۔خدا فراموشی ونفس پرستی میں وہ بھی فرعون کے راستے پر چل رہے تھے۔آپ ﷺ نے دعوت وتبلیغ اور صبر محض کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر تیرہ مکی سالوں میں جاں نثار ساتھیوں کی ایک جماعت تیار کی۔آپؐ کی دعوتی سرگرمیوں کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں بھی ایک جماعت کھڑی کر دی۔تیرہ سال بعد آپؐ نے مکّہ سے مدینہ ہجرت فرمائی۔ یہاں سے آپؐ نے انصارِ مدینہ کے ساتھ مل کر خالص انسانی سطح پر مخالف قوتوں کا سر کچلنے کے لیے اقدامات کا آغاز فرمایا۔مدینہ میں مسجد نبوی کی شکل میں مرکز کی تعمیر فرمائی۔انصار اور مہاجرین میں بھائی چارہ قائم کیا۔مدینہ کے یہودی جو ایمان نہیں لا رہے تھے' ان کے ساتھ پُرامن بقائے باہمی کا معاہدہ کیا۔مکّہ اور مدینہ کے درمیان اور اردگرد کے قبائل کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی پوزیشن واضح کر دیں کہ وہ مشرکینِ مکّہ کے ساتھ ہیں یا اللہ کے پیغمبر کے ساتھ ہیں' تاکہ آنے والے وقت میں مشرکینِ مکّہ سے تصادم کی صورت میں واضح رہے کہ کون کس کے ساتھ ہے۔پھر آپ ﷺ نے راست اقدام کرتے ہوئے مشرکینِ مکّہ کے تجارتی سفروں میں رکاوٹیں پیدا کرنا شروع کر دیں جس کے نتیجے میں مشرکینِ مکّہ کو واضح ہو گیا کہ محمدٌ رسول اللہ (ﷺ) اور آپؐ کے ساتھیوں کو ختم کیے بغیر انہیں معاشی سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔دو ہجری سے جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو آٹھ ہجری میں فتح مکّہ پر اختتام پذیر ہوا اور پورے جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کا غلبہ ہو گیا۔اس جدّوجُہد کا ہر قدم آنے والے دور میں کسی بھی انقلابی تبدیلی کے لیے ایسا سنگ میل ثابت ہوا کہ اس سے گزرے

بغیر تبدیلی کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا۔

فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا﴾ (الاعراف:۵۶) ''اور زمین میں اصلاح کے بعد اس میں فساد مت پھیلاؤ!'' یہ حقیقت ہے کہ خالقِ کائنات نے بنا سنوار کر معاملات انسان کے حوالے کیے ہیں' لیکن انسان نے شیطانی چکروں میں پڑ کر بگاڑ ہی پیدا کیا ہے۔آخری اصلاح پیغمبر آخر الزماں ﷺ کے ہاتھوں فرمائی اور یہ اصلاح اتنی ہمہ جہت' ہمہ پہلو اور مکمل تھی کہ صدیوں تک لوگوں نے اس کے تحت زندگی گزاری۔لیکن وقت کے ساتھ خدا فراموشی اور نفس پرستی کے ہاتھوں پھر سے انسان فرعونیت کے راستے پر چل نکلا ہے۔غیر منصفانہ انسانی مساوات کے اصول پر مبنی جمہوری طرزِ حکمرانی جس کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے فرمایا تھا کہ غلاظت کا جو ٹوکرا بادشاہت کی شکل میں ایک انسان کے سر پر رکھا تھا اسے تھوڑا تھوڑا کر کے سارے عوام میں تقسیم کر دیا گیا۔اب یہ فرعون G-20 , G-7 , G-5 , G-5 , G-4 وغیرہم کے ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ یہ اس دور کے آقا ہیں۔مسلمان ممالک کا حکمران طبقہ ان کا غلام ہے۔کوئی دوسرا آقا ان کی قیمت دے کر ان کو اپنا غلام بنا سکتا ہے یا خرید کر آزاد کر سکتا ہے۔اسلام کی تعلیمات ہیں کہ غلاموں کو آزاد کرایا جائے اور ان کو ساتھ ملا کر وقت کے فرعونوں کو راہِ راست پر لایا جائے۔ چنانچہ آزاد مسلمانوں کے سامنے درج ذیل چیلنجز ہیں:

(۱) اپنی قوم کو فرعونوں سے آزادی دلانا۔

(۲) اس دور کے فرعونوں کو شکست دے کر شریعتِ اسلامی کو نافذ کرنا۔

آزاد مسلمانوں کی زبان سے جاری ہونے والی دعوت میں لوگوں کو جہاں اللہ ربّ العزت کی بندگی کی طرف بلانا ہوتا ہے' وہاں لوگوں کے اندر غلامی سے آزادی کا جذبہ بیدار کرنا بھی شامل ہونا چاہیے۔فراعینِ وقت کا مقابلہ بھی ایک آزاد قوم ہی کر سکتی ہے۔اللہ کے فضل سے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے نعرۂ تکبیر سے آج کے فرعون بھی لرزتے ہیں۔ہر اعتبار سے ان کے دست و بازو بننے کی ضرورت ہے۔جدید علوم وفنون کے ماہر مسلمانوں کو اپنی خدمات انہیں پیش کرنا چاہئیں' تاکہ بے خدا ٹیکنالوجی کی جھوٹی جادوگری کا مقابلہ بھی کیا جا سکے۔(اُمّتِ مُسلمہ کی تاریخ کے پانچ اَدوار والی حدیث کی روشنی میں اس مضمون کو دیکھا جائے!) ❁❁

چالیس احادیث

شاہ ولی اللہ دہلویؒ

ترجمہ: مولانا فاروق خان

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ﷫ (م: ۱۷۶۲ء) کی مرتّب کی ہوئی یہ ’’چہل حدیث‘‘ مختلف خصوصیات کی حامل ہے۔ اس چہل حدیث کی تمام احادیث کو شاہ صاحبؒ نے ایک ہی سلسلۂ سند سے روایت کیا ہے اور اس سند کے صحیح اور مستند ہونے پر اپنا اطمینان ظاہر فرمایا ہے۔ ان احادیث کے رواۃ کے اسمائے گرامی‘ شاہ صاحب نے ۲۴ نقل کیے ہیں۔ گویا ۲۴ واسطوں سے نبی مکرم ﷺ کی یہ احادیث شاہ صاحبؒ تک پہنچی ہیں۔ آخری راوی حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ احادیث کو میں نے اسی ترتیب سے نقل کیا ہے جس ترتیب سے شاہ صاحبؒ نے ان کو مرتّب فرمایا ہے اور سب کے ساتھ ان کے مآخذ بھی درج کر دیے ہیں۔

’’چہل حدیث‘‘ میں نقل کی گئی حدیثیں نہایت جامع اور زندگی کے مختلف گوشوں پر حاوی ہیں۔ احادیث کے الفاظ اگرچہ مختصر ہیں‘ مگر معانی و مفاہیم کے لحاظ سے ان میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ چونکہ الفاظ مختصر ہیں اس لیے ان کو یاد کرنا اور برابر پڑھتے رہنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ لوگوں کی آسانی کے لیے احادیث کا اُردو ترجمہ اور مختصر تشریح بھی کر دی گئی ہے۔

حضرت علی ؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱) ((لَیْسَ الْخَبَرُ کَالْمُعَایَنَۃِ)) ’’خبر مشاہدہ کے برابر نہیں۔‘‘

(مسند احمد‘ ج ۱‘ ص ۲۷۱ عن ابن عباسؓ‘ ابن حبان اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ المقاصد الحسنۃ للسخاوی‘ ص ۳۵۲)

یہ حدیث مسند احمد میں حضرت ابن عباس ؓ سے ان الفاظ میں روایت کی گئی ہے:

((لَیْسَ الْخَبَرُ کَالْمُعَایَنَۃِ ، اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی اَخْبَرَ مُوْسٰی بِمَا صَنَعَ قَوْمُہٗ فِی الْعِجْلِ فَلَمْ یُلْقِ الْاَلْوَاحَ ، فَلَمَّا عَایَنَ مَا صَنَعُوْا اَلْقَی الْاَلْوَاحَ فَانْکَسَرَتْ)) ’’خبر آنکھ سے دیکھ لینے کے مانند نہیں ہوسکتی۔ خداوند تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بچھڑے کے متعلق جو کچھ اُن کی قوم نے کیا تھا اس کی خبر دی‘ لیکن اس سے متاثر ہو کر موسیٰ علیہ السلام نے (تورات کی) تختیوں کو نہیں پھینکا۔ مگر جب موسیٰ علیہ السلام (اپنی قوم میں آئے اور انہوں) نے اپنی آنکھوں سے اپنی قوم کے کرتوت دیکھے تو (غضب ناک ہو کر) تختیوں کو پھینک دیا اور وہ ٹوٹ گئیں۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ آنکھ سے کسی چیز کو دیکھ لینے کی بات ہی اور ہوتی ہے‘ خبر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ دیکھنے کا جو اثر دل پر ہوتا ہے‘ وہ خبر سننے سے نہیں ہوتا‘ خواہ آدمی کو اس خبر پر کتنا ہی یقین کیوں نہ ہو۔ اس کو آپ ﷺ نے ایک مثال دے کر سمجھایا کہ دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خداوند تعالیٰ نے خبر دی تھی کہ ان کی قوم نے ان کی عدم موجودگی میں بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ پر اس کا یہ اثر نہیں ہوا کہ وہ غصے میں آکر تورات کی تختیاں پھینک دیتے۔ لیکن جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے قوم کے کرتوت دیکھ لیے تو وہ غیظ و غضب میں آ گئے اور تورات کی تختیاں ایک طرف کو پھینک دیں کہ ہم تو تمہارے لیے کتابِ ہدایت لے کر آئے اور تمہاری سرکشی کا یہ حال ہے۔

(۲) ((اَلْحَرْبُ خُدْعَۃٌ)) ’’جنگ ایک چال ہے۔‘‘

(صحیح البخاری‘ کتاب الجہاد والسیر‘ باب الحرب خدعۃ ‘ صحیح مسلم‘ کتاب الجہاد والسیر باب الجواز الخداع فی الحرب)

جنگ میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اپنی جنگی تدابیر اور دفاعی رازوں سے دشمن کو باخبر نہ ہونے دیا جائے۔

(۳) ((اَلْمُسْلِمُ مِرْآۃُ الْمُسْلِمِ)) ’’مسلم‘ مسلم کا آئینہ ہے۔‘‘

(ترمذی اور ابوداوٗد نے یہ روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے: اَلْمُؤْمِنُ مِرْآۃُ الْمُؤْمِنِ)

ایک مسلمان کو آئینہ کی طرح اپنے بھائی کے اندر پائے جانے والے کسی عیب کو اس پر ظاہر تو ضرور کر دینا چاہیے‘ لیکن اس کے پیچھے جذبہ خیر خواہی کا ہونا چاہیے اور مقصد محض اصلاح ہو نہ کہ بھائی کے کسی عیب کی تشہیر۔

(۴) ((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ))

’’جس سے مشورہ کیا جائے ضروری ہے کہ وہ امانت داری سے کام لے۔‘‘

(سنن الترمذی‘ ابواب الزھد‘ حدیث: ۲۳۴۹ ‘ سنن ابن ماجه‘ کتاب الادب‘ باب المستشار مؤتمن‘ حدیث:۳۷۴۳)

یعنی وہ مفید اور صحیح مشورہ دے اور مشورہ لینے والے شخص کے راز کو کسی پر ظاہر نہ کرے۔ کیونکہ یہ ایک طرح کی خیانت ہے‘ جس کی توقع کسی مسلم سے نہیں کی جاسکتی۔

(۵) ((اَلدَّالُّ عَلَی الْخَیْرِ کَفَاعِلِهٖ))

’’خیر اور بھلائی کے کام کی طرف رہنمائی کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس پر عمل کرنے والا۔‘‘

(سنن الترمذی‘ کتاب الذبائح‘ ابواب العلم‘ حدیث: ۲۶۶۲)

یعنی یہ بھی ایک نیک عمل ہے کہ کسی کو خیر اور نیکی کا کوئی کام بتایا جائے۔ اگر اس کی رہنمائی سے کسی شخص کو عملِ خیر کی توفیق ملتی ہے تو رہنمائی کرنے والا شخص بھی اس کارِ خیر میں شریک ہوگا۔ کیونکہ اس کی رہنمائی اگر میسر نہ ہوتی تو وہ نیک کام انجام نہیں دیا جاسکتا تھا۔

(۶) ((اِسْتَعِیْنُوْا عَلَی الْحَوَائِجِ بِالْکِتْمَانِ))

’’حاجتوں اور ضرورتوں کے سلسلے میں پوشیدہ طور پر استعانت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔‘‘

(طبرانی کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: اِسْتَعِیْنُوْا عَلٰی قَضَاءِ حَوَائِجِکُمْ بِالْکِتْمَانِ۔ مجمع الزوائد‘ ج۸‘ ص۱۲۵)

یعنی کسی کام کی تکمیل کی فکر اور تدبیر خاموشی کے ساتھ کرنی چاہیے۔ خواہ مخواہ اس کی تشہیر کرنے میں بہت سی خرابیوں کے رونما ہونے کے اندیشے رہتے ہیں۔

(۷) ((اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ))

’’جہنم کی آگ سے بچو‘ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی دے کر سہی۔‘‘

(صحیح البخاری‘ کتاب الزکٰوۃ ‘ باب : اتقوا النّار ولو بشق تمرة‘ حدیث:۱۳۶۲)

یعنی اصل سوال مقدار کا نہیں‘ اخلاص کا ہے۔ تمہارے پاس اگر دینے کو کھجور کا ایک ٹکڑا ہی ہے تو‘ تم اسے ہی صدقہ کر کے اس کا ثبوت بہم پہنچا سکتے ہو کہ تم اللہ سے ڈرنے والے ہو اور بندگانِ خدا کے لیے تمہارے دل میں نرم گوشہ موجود ہے۔

(۸) ((اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْکَافِرِ))

’’دُنیا مؤمن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے۔‘‘

(صحیح مسلم‘ کتاب الزھد‘ حدیث: ۵۳۶۸ ۔ سنن الترمذی‘ ابواب الزھد‘ باب مثل الدنیا‘ حدیث:۴۱۱۱)

مؤمن کی امیدیں آخرت سے وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور جنت کا خواست گار اور اُمیدوار ہوتا ہے‘ جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس لیے وہ دنیوی پریشانیوں سے بددل نہیں ہوتا‘ جس طرح وہ شخص ہوتا ہے جس کی نگاہ میں دنیا ہی سب کچھ ہے۔ مؤمن جانتا ہے کہ دنیا کے مصائب ومشکلات عارضی ہیں‘ ایک دن اسے لازماً ان سے نجات مل جائے گی۔ اس لیے وہ حدودِ الٰہی کے اندر رہ کر زندگی بسر کرتا ہے۔

(۹) ((اَلْحَیَاءُ خَیْرٌ کُلُّهٗ)) ’’شرم وحیا سراسر بھلائی ہے۔‘‘

(صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب شعب الایمان‘ حدیث:۷۹)

آدمی کے اندر اگر حیا موجود ہے تو پھر اس سے کسی برائی اور خرابی کا اندیشہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اگر کسی شخص کے اندر حیا اور شرم نہیں ہے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب کیا حرکت کر بیٹھے۔

(۱۰) ((عِدَةُ الْمُؤْمِنِ کَالْاَخْذِ بِالْیَدِ))

’’مؤمن کا وعدہ ایسا ہے‘ جیسے ہاتھ پکڑ لینا۔‘‘

(الجامع الصغیر للسیوطی‘ حدیث:۸۱۲۸)

یعنی مؤمن اپنے وعدہ کا پاس ولحاظ رکھتا ہے۔ اس سے کسی وعدہ خلافی کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اس کے وعدے پر پورا بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر وہ تمہیں کوئی چیز دینے کا وعدہ کرتا ہے تو یوں سمجھو کہ وہ چیز تمہارے ہاتھ میں پہنچ چکی۔

(۱۱) ((لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثَةِ اَیَّامٍ))

’’مؤمن کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ وہ اپنے بھائی کو چھوڑے رکھے۔‘‘

(صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب ما ینھی عن التحاسد‘ حدیث: ۵۷۲۵‘ صحیح مسلم‘ کتاب البر والصلة‘ باب النھی عن التحاسد‘ حدیث:۴۶۴۶)

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر کسی شکایت یا ناراضی کی وجہ سے کوئی اپنے مسلم بھائی سے کٹ گیا ہے' تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام میں اس طرح تعلق منقطع کیے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسے لازماً تین روز کے اندر اپنے بھائی سے صلح کر لینی چاہیے۔ دینی مقاصد' ذاتی مفادات کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ دینی مقاصد کی تکمیل اہلِ ایمان کے اجتماعی استحکام کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ایسا کوئی طرزِ عمل اختیار نہ کرے جس سے اجتماعی نظم اور اجتماعی قوت کو نقصان پہنچتا ہو۔ اس حدیث کی اہمیت و معنویت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے پیش نظر اسلامی نظامِ زندگی کا وہ تصور ہو' جس سے قرآن اور نبی ﷺ کی تعلیمات ہمیں آشنا کراتی ہیں۔

(۱۲) ((لَيْسَ مِنَّا مَنْ غَشَّنَا))

''جو ہمارے ساتھ فریب و خیانت کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

(المستدرک للحاکم' کتاب البیوع' حدیث: ۲۰۹۴)

یعنی جو شخص ذاتی فائدے کے لیے فریب اور خیانت سے کام لیتا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کی ذمہ داری فراموش کر دیتا ہے' تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنا رشتہ اور تعلق مسلم گروہ سے منقطع کر رہا ہے۔ انجام کے لحاظ سے یہ جس قدر خطرناک بات ہے' اس کا اسے احساس ہونا چاہیے۔

ایک بار نبی کریم ﷺ بازار تشریف لے گئے۔ وہاں ایک شخص نے بیچنے کے لیے گیہوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ آپؐ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو اندر گیہوں بھیگے ہوئے تھے۔ آپؐ نے وجہ دریافت فرمائی تو اس نے کہا کہ میں نے ارادے سے گیہوں نہیں بھگوئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بھیگے ہوئے گیہوں اوپر کیوں نہیں رکھے؟ اسی موقع پر آپ ﷺ نے وہ بات ارشاد فرمائی' جو اس حدیث میں نقل کی گئی ہے۔

(۱۳) ((مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَأَلْهٰى))

''جو چیز تھوڑی ہو مگر اس سے ضرورت پوری ہو جاتی ہو' وہ اس چیز سے بہتر ہے جو زیادہ ہو' مگر آدمی کو غفلت میں ڈال دے۔''

(مسند احمد' مسند الانصار' حدیث ابی الدرداء' حدیث: ۲۱۱۸۸)

مال دار لوگ اکثر اپنی دولت کی کثرت کی وجہ سے حق سے بے گانہ اور غافل ہو جاتے

ہیں۔ ایسی کثیر دولت سے وہ تھوڑا مال کہیں بہتر ہے' جو آدمی کی ضروریات کے لیے کافی ہو اور اس سے آدمی کے غفلت میں پڑنے کا اندیشہ نہ کیا جا سکتا ہو۔ اسی پر دنیا کی دوسری چیزوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان میں کون سی چیز کس صورت میں بہتر ہے اور کس صورت میں بہتر نہیں ہے۔

(۱۴) ((اَلرَّاجِعُ فِيْ هِبَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَرْجِعُ فِيْ قَيْئِهٖ))

''اپنی دی ہوئی چیز کو واپس لینے والا کُتّے جیسا ہے' قے کر کے پھر اسے چاٹ رہا ہو۔''

تحفے میں یا اللہ کی راہ میں دی ہوئی چیز کو واپس لینا انتہائی ذلیل حرکت ہے' جس کے تصوّر سے بھی آدمی کو گھن آنی چاہیے۔ ایسی حرکت اخلاق سے گرا ہوا شخص ہی کر سکتا ہے۔ اِس حدیث میں دی ہوئی چیز کو واپس لینے والے کو کُتّے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نبی ﷺ نے دیے ہوئے گھوڑے کو قیمت دے کر بھی واپس لینے سے حضرت عمرؓ کو روکا تھا' کیونکہ اس صورت میں بھی یہ عمل دی ہوئی چیز کو واپس لینے سے مشابہت رکھتا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دین کا مزاج کس قدر نازک و لطیف ہے۔

(۱۵) ((اَلْبَلَاءُ مُوَكَّلٌ بِالْمَنْطِقِ)) ''آفت اور بلا بولنے پر مسلّط ہوتی ہے۔''

(مسند الشہاب القضاعی' حدیث: ۲۱۸)

اکثر زبان کا غلط استعمال مصیبت اور آزمائش کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ خاموشی آدمی کو ہزار بلاؤں سے محفوظ رکھتی ہے۔ کتنے ہی اچھے تعلقات محض زبان کو قابو میں نہ رکھنے کی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں اور آدمی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ زبان کی کاٹ تلوار سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ زبان کے ناروا استعمال سے بعض اوقات دلوں میں ایسے زخم ہو جاتے ہیں جو کبھی نہیں بھر سکتے۔ اس لیے بولنے اور زبان کے استعمال کرنے میں آدمی حد درجہ محتاط رہے۔

(۱۶) ((اَلنَّاسُ كَاَسْنَانِ الْمُشْطِ))

''لوگ ایسے ہیں' جیسے کنگھی کے دندانے ہوتے ہیں۔''

(مسند الشہاب القضاعی' حدیث: ۱۸۶)

یعنی لوگوں کی فطری اور مطلوب حالت یہ ہے کہ ان کا باہمی ربط و تعلق اس طرح کا ہو'

جیسا ربط و تعلق کنگھی کے دندانوں کے مابین ہوتا ہے۔ کنگھی کے دندانے صاف اور سیدھے رہ کر باہم ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ اگر کنگھی کے کچھ دندانے ٹوٹ جائیں تو پوری کنگھی ناقص اور خراب ہو جاتی ہے۔ مثالی معاشرہ وہی ہے جس کے افراد باہمی ربط و تعلق کی اہمیت کو سمجھتے اور اس کا پاس و لحاظ رکھتے ہوں۔

(۱۷) ((اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ)) ’’اصل تونگری دل کی تونگری ہے۔‘‘

(صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب الغنی غنی النفس‘حدیث:۶۰۹۱‘ صحیح مسلم‘ کتاب الزکوٰۃ‘ باب لیس الغنی عن کثرۃ العرض‘ حدیث:۱۸۰۵)

دل اگر مستغنی نہیں ہے تو بڑی سے بڑی دولت بھی بے کار ہے۔ لیکن اگر انسان کا دل مطمئن ہے تو ظاہر کے اعتبار سے خواہ وہ مال دار نہ بھی ہو تو کوئی نقصان کی بات نہیں۔ کہا بھی گیا ہے ؏ تونگری بہ دل است‘ نہ بہ مال!

(۱۸) ((اَلسَّعِیْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَیْرِہٖ))

’’سعادت مند وہ ہے‘ جو دوسرے کی حالت سے نصیحت حاصل کرے۔‘‘

(امام مسلم نے کتاب القدر میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کی حیثیت سے بیان کیا ہے‘ المعجم الکبیر للطبرانی‘ باب من اسمہ حمزۃ‘ حدیث:۲۹۶۸)

بُرے لوگوں کے بُرے انجام کو دیکھ کر بھی جو لوگ عبرت اور نصیحت حاصل نہیں کرتے اور بُرائیوں اور گناہ کے کاموں سے باز نہیں آتے وہ آخر کار خود نشانِ عبرت بن کر رہتے ہیں۔

(۱۹) ((اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِکْمَۃً وَّاِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا))

’’بعض اشعار سراسر حکمت ہوتے ہیں اور بعض تقریریں جادو ہوا کرتی ہیں۔‘‘

(صحیح البخاری‘ کتاب النکاح‘ باب الخطبہ‘ کتاب الادب‘ باب یجوز من الشعر والرجز‘ حدیث:۵۷۹۹)

ایسے اشعار جو علم و حکمت کا خزینہ ہوں‘ لائقِ تحسین ہیں۔ بعض تقاریر بھی اپنے اندر جادو کا سا اثر رکھتی ہیں۔ البتہ وہی جادو اثر تقریر پسندیدہ قرار پائے گی‘ جو حق و صداقت کے لیے جاری ہو۔ لیکن اگر وہ باطل کی خدمت کے لیے ہے تو اس جادو اثری کو سامانِ ہلاکت ہی کہا جائے گا۔

(۲۰) ((عَفْوُ الْمُلُوْکِ اَبْقٰی لِلْمُلْکِ))

’’بادشاہوں کا عفو و درگزر سے کام لینا سلطنت کی بقا کا ضامن ہے۔‘‘

(الجامع الصغیر‘ باب حرف العین‘ حدیث:۵۴۳۹)

حاکم کا فرض ہے کہ عوام کے ساتھ ہمدردی اور بہی خواہی کا سلوک رکھے۔ اس صورت میں لازماً وہ لوگوں کے لیے سخت گیر نہ ہوگا‘ بلکہ حتی الامکان وہ عفو و درگزر ہی سے کام لے گا۔ عوام بھی اس کے کریمانہ اخلاق سے متاثر ہوں گے اور حکومت کے ساتھ تعاون کریں گے۔ یہ چیز سلطنت کے استحکام کا باعث ہوگی۔ اس کے برخلاف عوام میں اگر بے اطمینانی پائی جاتی ہے تو اسے سلطنت کے حق میں فالِ نیک نہیں کہا جا سکتا۔

(۲۱) ((اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ))

’’آدمی اُسی کے ساتھ ہے‘ جس سے وہ محبت رکھتا ہے۔‘‘

(صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب علامۃ حب اللّٰہ‘ حدیث:۵۸۲۳‘ صحیح مسلم‘ کتاب البر والصلۃ والآداب‘ باب المرء مع من احب‘ حدیث:۴۸۸۶)

محبت بڑا طاقت ور اور بنیادی جذبہ ہے۔ جس شخص یا گروہ سے آدمی محبت رکھتا ہے‘ اس کا شمار اسی کے ساتھ ہوگا۔ اصل اعتبار خلوص و محبت کا ہے‘ دوسری چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ سچی محبت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ آدمی کے طرزِ عمل پر اثر انداز ہو اور وہ کوئی ایسا کام نہ کرے‘ جو اس کی محبوب شخصیت کی مرضی کے خلاف ہو یا وہ اس گروہ کے مفاد کے خلاف ہو جس سے وہ محبت کا تعلق رکھتا ہے۔

(۲۲) ((مَا ھَلَکَ امْرُؤٌ عَرَفَ قَدْرَہٗ))

’’وہ شخص ہلاک ہونے سے محفوظ رہا جس نے اپنی قدر پہچانی۔‘‘

(لم اجد)

آدمی تباہی اور ہلاکت سے اسی صورت میں دوچار ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی حیثیت اور قدر و قیمت سے بے خبر رہ کر زندگی گزارتا ہے۔ ایسی حالت میں یا تو وہ احساسِ کمتری کا شکار ہوگا اور زندگی میں ایسا طرزِ عمل اختیار کرے گا جو اُس کے شایانِ شان نہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو پستی میں گرا کر رہے گا اور کوئی چیز نہ ہوگی جو اسے تباہی و بربادی سے بچا سکے۔ یا پھر

وہ بے جا پندار میں مبتلا ہو کر اپنے فرائض اور ذمے داریوں کی طرف سے یکسر غافل ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں خسران اور ہلاکت کے سوا اُس کا کوئی اور انجام نہیں ہوسکتا۔

(۲۳) ((اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَر))

''بچہ عورت کے حصے میں آئے گا' رہا زانی تو اس کے لیے پتھر ہے۔''

(صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب تفسیر المشتبهات' حدیث: ۱۹۶۳' صحیح مسلم' کتاب الرضاع' باب الولد للفراش' حدیث: ۲۷۲۳)

یعنی زنا کار درحقیقت زیاں کار ہے۔ بدکاری کے صلے میں اس کو بچہ نہیں مل سکتا بلکہ سزا میں اُس پر پتھر ہی پڑیں گے۔

(۲۴) ((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى))

''اُوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔''

(صحیح البخاری' کتاب الزکوۃ' باب الاستعفاف فی المسئلة' حدیث: ۱۴۱۴)

فضیلت اسی میں ہے کہ آدمی کوشش اس بات کی کرے کہ وہ دینے والا ہو نہ کہ لینے والا۔

(۲۵) ((لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ مَنْ لَّا يَشْكُرُ النَّاسَ))

''وہ شخص اللہ کا بھی شکر گزار نہیں ہے جو انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔''

(سنن الترمذی' ابواب البر والصلة' باب ماجاء فی الشکر' حدیث: ۱۹۲۶)

جو شخص لوگوں کے احسانات کا شکریہ ادا نہیں کرتا بلکہ احسان فراموشی کا ثبوت دیتا ہے' تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے اندر حق شناسی کا مادہ ہی نہیں ہے۔ پھر یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ اللہ ربّ العزت کا شکر گزار بندہ بن سکے گا؟ احسان شناسی اور اعترافِ حق دراصل ایک اعلیٰ اخلاقی قدر ہے۔

(۲۶) ((حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ))

''کسی چیز سے تمہاری محبّت اندھا اور بہرا بنا دینے کی خاصیت رکھتی ہے۔''

(سنن ابی داؤد' کتاب الادب' ابواب النوم' باب فی الھوی' حدیث: ۴۴۸۶)

یعنی انسان کی یہ ایک بڑی کمزوری ہے کہ وہ جب کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو وہ اس محبت میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ پھر اسے حق اور ناحق سجھائی نہیں دیتا' اور نہ وہ اس پوزیشن میں ہوتا

ہے کہ اس معاملے میں کسی کی نصیحت سن سکے۔ اس لیے پیار اور محبت کے معاملے میں آدمی کو ہمیشہ محتاط رہنا چاہیے' خواہ یہ محبت بیوی اور بچوں کی ہو' یا کسی دوسری چیز کی۔ محبت اگر اندھی ہے اور بالعموم یہ اندھی ہی ہوا کرتی ہے تو وہ آدمی سے حق و باطل کی تمیز سلب کرسکتی ہے۔

(۲۷) ((جُبِلَتِ الْقُلُوْبُ عَلٰى حُبِّ مَنْ اَحْسَنَ اِلَيْهَا وَعَلٰى بُغْضِ مَنْ اَسَاءَ اِلَيْهَا))

''اپنے ساتھ احسان کرنے والے شخص کی محبت اور برائی کرنے والے کی عداوت' یہ انسانی قلوب کی فطرت میں شامل ہے۔''

(مسند الشہاب القضاعی' حدیث: ۵۶۶)

یعنی کسی کے دل کو احسان اور حسنِ اخلاق کے ذریعے سے جیتا جاسکتا ہے۔ ایسا دل ملنا مشکل ہے جو احسان سے متاثر نہ ہو۔ اسی طرح کسی کے ساتھ برائی سے پیش آ کر اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس کا وہ کوئی بُرا اثر نہ لے گا' اور اس کے دل میں ہمارے لیے عداوت اور نفرت کا جذبہ پیدا نہ ہوگا۔ اپنے محسن کے لیے دل میں محبت کا جذبہ ابھرنا اور بدخواہ کے لیے نفرت کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے' اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ دوست بنانا پسندیدہ بات ہے۔ خواہ مخواہ کسی کو دشمن بنا لینا ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔

(۲۸) ((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ))

''گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔''

(سنن ابن ماجہ' کتاب الزھد' باب ذکر التوبة' حدیث: ۴۲۴۸)

مطلب ہے کہ کسی گناہ گار کو اپنے گناہوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے ہرگز مایوس نہ ہونا چاہیے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کے سارے ہی گناہوں کو بخش سکتا ہے' بشرطیکہ وہ سچے دل سے توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے۔ پھر تو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ ایسا ہو جائے گا جیسے وہ کبھی گناہوں کے قریب بھی نہیں گیا۔

(۲۹) ((اَلشَّاهِدُ يَرٰى مَا لَا يَرَى الْغَائِبُ))

''حاضر اور موجود شخص جو کچھ دیکھتا ہے' اسے وہ شخص نہیں دیکھ سکتا جو موجود نہ ہو۔''

(مشکل الآثار للطحاوی' باب بیان مشکل ما رُوِی عن رسول اللہ ﷺ' حدیث: ۴۳۳۳)

اسی لیے اعتماد اس شخص کی گواہی پر کیا جاتا ہے جو موقع پر موجود رہا ہو۔

(۳۰) ((إِذَا جَاءَكُمْ كَرِيمُ قَوْمٍ فَأَكْرِمُوهُ))

''جب کسی قوم کا بزرگ شخص تمہارے پاس آئے تو اُس کی عزّت کرو۔''

(السنن الکبریٰ للبیھقی' کتاب القسامة' باب قتال اھل البغی' حدیث:۱۵۵۲۴)

جوشخص ہمارے پاس آئے ہم اس کے مرتبہ ومقام کا لحاظ رکھیں' یہ اسلامی اخلاق کا تقاضا ہے۔ اگر ہم نے کسی شخص کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کا وہ فی الواقع مستحق تھا تو پھر ہمیں اس کی امید نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ہمارے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم کرے گا۔ اس صورت میں وہ ہمارے دین وایمان کا اثر بھی قبول نہیں کرسکتا۔ ایک داعیٔ اسلام کو کبھی وہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے جو اسلام کی طرف آنے میں لوگوں کے لیے رکاوٹ بن سکتا ہو۔

(۳۱) ((اَلْيَمِينُ الْفَاجِرَةُ تَدَعُ الدِّيَارَ بَلَاقِعَ))

''جھوٹی قسم ملک کو ویران کر کے چھوڑتی ہے۔''

(السنن الصغیر للبیھقی' کتاب الایمان والنذور' باب الیمین الغموس' ح ۳۱۶۰)

جھوٹی قسمیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ لوگوں کے اندر نہ تو اپنے بھائیوں کی خیرخواہی کا جذبہ پایا جاتا ہے اور نہ ان کے دل میں خدا کا خوف باقی ہے۔ جب کسی ملک کے لوگوں کی اخلاقی حالت اس پستی کو پہنچ گئی ہو تو پھر اس ملک کو ویرانی اور تباہی گھیر لیتی ہے۔

(۳۲) ((مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ))

''جوشخص اپنے مال کی وجہ سے مارا جائے' وہ شہید ہے۔''

(صحیح البخاری' ابواب المظالم' باب من قتل دون مالہ' حدیث:۲۳۶۸)

یعنی اپنے مال واسباب کی حفاظت میں اگر کسی مؤمن کی جان چلی گئی تو وہ ضائع نہیں ہوئی بلکہ اس مردِ مؤمن کو شہادت کا درجہ حاصل ہوگا۔ اپنے مال کے لیے لڑنا اور ڈاکا ڈالنے والوں سے مقابلہ کرنا ایک طرح سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا درجہ رکھتا ہے۔ مومن اپنے مال کو خدا کی امانت سمجھتا ہے اور اس کو خدا کی رضا کے لیے اس کے حکم کے مطابق خرچ کرنا چاہتا ہے۔

(۳۳) ((اَلْأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ)) ''اعمال کا انحصار نیت پر ہے۔''

(صحیح البخاری' باب ھجرۃ النبی ﷺ' حدیث: ۳۷۰۷)

یعنی انسان کا وہی عمل باعثِ اجر وثواب ہے' جس کے پیچھے اچھی نیت رہی ہو۔ نیت اگر درست نہیں تو بڑے سے بڑا عمل بھی بے سود ہے۔ ایمان کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ فرد محض خدا کی خوشنودی اور اُس کی رضا کے لیے کام کرے۔ کسی کام کا محرک اگر نام ونمود کی خواہش یا کوئی اور مذموم جذبہ ہے' تو وہ اللہ کے یہاں ہرگز مقبول نہیں ہوسکتا۔ ایک حدیث میں ریا اور نمائش کے لیے کام کرنے کو شرک تک کہا گیا ہے۔

(۳۴) ((سَيِّدُ الْقَوْمِ فِي السَّفَرِ خَادِمُهُمْ))

''قوم کا سردار سفر میں افرادِ قوم کا خادم ہوتا ہے۔''

(رواہ البیھقی فی شعب الایمان' فصل فی ترک الغضب' حدیث: ۸۱۵۰)

سردارِ قوم یا قوم کے قائد کا فرض ہے کہ وہ قوم کے کام آئے۔ قوم کی فلاح وبہبود کے لیے تدابیر اختیار کرے اور حتی المقدور قوم کو فائدہ پہنچائے۔ اُس کی سعی وجہد اس بات کے لیے ہو کہ اُس کی قوم حق وصداقت سے بے بہرہ نہ رہے۔ وہ اسے مقامِ عزّت تک پہنچانے کی پوری کوشش کرے۔ لیکن آج حضور ﷺ کی اس بیش قیمت تعلیم کو فراموش کردیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قائد اپنے کو خادم تصوّر کرنے کے بجائے مخدوم سمجھتا ہے۔

(۳۵) ((خَيْرُ الْأُمُورِ أَوْسَاطُهَا))

''بہترین کام وہ ہے جس میں اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے۔''

(رواہ البیھقی فی شعب الایمان' باب الاقتصاء فی النفقة' حدیث: ۶۳۰۸)

کام کوئی بھی ہو اس میں افراط وتفریط سے بچنا ضروری ہے۔ کسی معاملے میں غیر معتدل رویّہ اختیار کرنے سے مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں' جن کا پہلے سے آدمی کو اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ معتدل اور متوازن طرزِ عمل ہی وہ طرزِ عمل ہے جسے اختیار کر کے آدمی آخر تک اس پر قائم رہ سکتا ہے۔ وہی کام نتیجہ خیز ہوسکتا ہے جسے آخر تک انجام دیا جائے۔

(۳۶) ((اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لِأُمَّتِي فِي بُكُورِهَا يَوْمَ الْخَمِيسِ))

''اے اللہ میری اُمّت کے حق میں پنج شنبہ کے دن کے شروع میں برکت دے۔''

(سنن ابن ماجہ' کتاب التجارات' باب ما یُرجی من البرکة فی البکور' حدیث:۲۲۳۴)

نبی اکرم ﷺ پنج شنبہ (جمعرات) کے دن باہر جانے کو پسند فرماتے تھے۔ غزوۂ تبوک

کے لیے آپؐ پنج شنبہ ہی کے دن نکلے تھے۔ آپ ﷺ چھوٹا یا بڑا لشکر کہیں روانہ کرتے تو دن کے اوّل وقت روانہ فرماتے۔ پنج شنبہ کی صبح کے لیے برکت کی دعا جو آپؐ نے مانگی ہے‘ اس سے آپؐ کی یہ تمنّا بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اُمت خدا کی راہ میں نکلنا ترک نہ کرے۔ یوں تو ہر ایک دن اللہ ہی کا ہے لیکن بعض پہلوؤں سے بعض دنوں کو خصوصیت حاصل ہے۔ پنج شنبہ کے دن نکلنے کی جو فضیلت ہے اس کے کئی وجوہ ممکن ہیں۔ ایک تو اس روز بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کی جناب میں پیش ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ پنج شنبہ کو عربی میں خمیس کہتے ہیں‘ جس کے معنی لشکر کے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ دن عملِ جہاد کے لیے فالِ نیک کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضورِ اَقدس ﷺ کی دعا حاصل کرنے کی ایک شکل بھی اس حدیث سے نکلتی ہے۔ اگر کوئی نیا کام کرنا ہو تو اسے پنج شنبہ کے دن سویرے شروع کیا جائے۔

(۳۷) ((کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا)) ’’لگتا ہے کہ محتاجی کفر ہو جائے۔‘‘

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان‘ حدیث: ۶۳۱۹)

یعنی فقر اور محتاجی کے سبب سے آدمی کفر تک پہنچ سکتا ہے۔ افلاس کی وجہ سے کسی آدمی کا کفر میں پڑنا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ فقر و فاقہ‘ افلاس وغیرہ آدمی کے ایمان کے لیے سخت آزمائش ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں کسی ایسی آزمائش میں نہ ڈالے جو ہمارے ایمان کے لیے فتنہ ثابت ہو سکے۔

(۳۸) ((اَلسَّفَرُ قِطْعَۃٌ مِّنَ الْعَذَابِ)) ’’سفر عذاب کا ایک حصّہ ہے۔‘‘

(صحیح بخاری‘ ابواب العمرۃ‘ حدیث: ۱۷۲۰‘ صحیح مسلم‘ کتاب الامارۃ‘ باب السفر قطعۃ من العذاب‘ حدیث: ۳۶۴۶)

سفر اور حضر میں بڑا فرق ہے۔ سفر میں وہ اطمینان اور آرام حاصل نہیں ہوتا جو آدمی کو اپنے گھر پر میسّر ہوتا ہے۔ اس لیے سفر اُسی وقت اختیار کرنا چاہیے جب واقعی کوئی ضرورت ہو‘ بلاضرورت سفر اختیار کرنا اپنے اوقات کا صحیح استعمال نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ((فَاِذَا قَضٰی نَھْمَتَہٗ مِنْ وَجْھِہٖ فَلْیُعَجِّلْ اِلٰی اَھْلِہٖ)) یعنی مسافر اپنے سفر کی غرض پوری کرے تو اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹنے میں جلدی کرے۔ (صحیح البخاری‘ کتاب الاطعمۃ‘ باب ذکر الطعام‘ حدیث: ۵۱۱۹)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب آدمی سفر میں ہو اور زحمتیں پیش آئیں تو پریشان ہونے کے بجائے اسے یہ خیال کرنا چاہیے کہ وہ اپنے گھر میں نہیں ہے۔ موجودہ دور نے گرچہ سفر میں بہت سی سہولتیں فراہم کر دی ہیں‘ لیکن اس کے باوجود سفر آج بھی سفر ہی ہے۔

(۳۹) ((اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ))

’’مجلسوں کے لیے امانت داری لازم ہے۔‘‘

(سنن ابی داؤد‘ کتاب الادب‘ باب نقل الحدیث‘ حدیث ۴۲۴۷)

یعنی اہلِ مجلس کا فرض ہے کہ وہ پوری رازداری سے کام لیں۔ مجلس کی کسی ایسی بات کو باہر بیان نہ کریں جس سے کسی قسم کے فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو۔ مجلس میں جو باتیں ہوتی ہیں ان کو امانت تصوّر کریں‘ جس کی حفاظت عقل عام کے نزدیک بھی ضروری ہے۔ بالعموم اس معاملے میں لوگوں سے بڑی کوتاہی ہوتی ہے‘ جس کے نتیجے میں طرح طرح کی خرابیاں معاشرے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کتنے ہی لوگوں کے باہمی تعلقات اس سے متاثر ہوتے ہیں۔

(۴۰) ((خَیْرُ الزَّادِ التَّقْوٰی)) ’’بہترین زادِراہ تقویٰ ہے۔‘‘

(صحیح ابن حبان‘ کتاب الثواب‘ فیض القدیر‘ ج۳‘ ص۲۷۳)

یہ بات حضور ﷺ نے قرآن کی روشنی میں فرمائی ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی﴾ (البقرۃ:۹۷) ’’اور تقویٰ کا زادِ راہ ساتھ لے لو‘ کیونکہ سب سے بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے‘‘۔ مسافر کے لیے زادِ راہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح پاکیزہ اور صحیح زندگی تقویٰ کے بغیر میسّر نہیں آتی اور نہ تقویٰ کے بغیر ایسی زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ تقویٰ وہ زادِ راہ ہے جو سفرِ حیات میں بھی کام آتا ہے اور منزل پر پہنچنے کے بعد بھی اس کی ضرورت پیش آئے گی۔ تقویٰ ہی آخرت میں انسان کی کامیابی کا ضامن ہے۔

(تشکّر: ترجمان القرآن‘ جنوری ۲۰۲۲)

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

مساجد

روحانی وفکری رہنمائی کے مراکز

احمد علی محمودی

مسجد کے معنی

مسجد کے لغوی معنی ''سجدہ گاہ'' کے ہیں اور اسلامی اصطلاح میں وہ جگہ جو نماز کے لیے وقف کر دی جائے' اسے مسجد کہا جاتا ہے۔ مسجد مسلمانوں کی عبادت گاہ کا نام ہے' جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا﴾ (الحج:۴۰)

''اور اگر اللہ تعالیٰ ایک دوسرے کے ذریعہ لوگوں کا زور نہ توڑتا تو راہبوں کے خلوت خانے' عیسائیوں کے گرجے' یہودیوں کے معبد اور مسلمانوں کی مساجد جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے گرادی جاتیں۔''

اس آیتِ مبارکہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ مسجد مسلمانوں کی عبادت گاہ کا نام ہے۔ چنانچہ مساجد کا شمار اسلامی شعائر میں ہوتا ہے' جیسا کہ امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں فرماتے ہیں: فضل بناء المسجد وملازمته وانتظار الصلاة فيه ترجع الى انه من شعائر الاسلام ''مسجد بنانے' اس میں حاضر ہونے اور وہاں بیٹھ کر نماز کا انتظار کرنے کی فضیلت کا سبب یہ ہے کہ مسجد شعائرِ اسلام میں سے ہے۔''

مقدّس مقام

''مسجد'' کہنے کو تو ایک ظرف یعنی مقام (جگہ) ہے جہاں اللہ ربّ العزت کے حضور سجدہ ریز ہوا جاتا ہے' جو دیکھنے کے اعتبار سے عام عمارتوں کی طرح اسی دُنیا کی بنی ہوئی عمارتی چیزوں

کے ملانے سے ہی بنتی ہے۔ اس میں آنے جانے والے' صفائی کرنے' اذانیں دینے' نمازیں پڑھانے والے عام انسان ہی ہوتے ہیں۔ اس میں اسی طرح کی ضروریاتِ زندگی بھی ہوتی ہیں جس طرح کسی گھر کی ضروریات مثلاً پانی و بجلی وغیرہ' لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ ایسی مقدس جگہ ہے جہاں سر کو بارگاہِ ربّ العزت میں رکھ کر گڑگڑایا جاتا ہے۔ دُنیا کے جھمیلوں میں اُلجھے ہوئے اور پریشان حال لوگوں کے دل کا درماں جس مطب اور دواخانہ میں ہے' وہ مسجد ہی ہے۔ مسجد ہی بے کسوں کی دادرسی کی جگہ ہے۔ وہ' جسے اپنوں نے چھوڑا ہو' غیروں نے دھتکارا ہو' جس کی شنوائی کسی در پر نہ ہو رہی ہو' اس کی شنوائی جس در پر ہوتی ہے' وہ یہی مقدّس مقام ''مسجد'' ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَحَبُّ الْبِلَادِ اِلَى اللّٰهِ مَسَاجِدُهَا، وَاَبْغَضُ الْبِلَادِ اِلَى اللّٰهِ اَسْوَاقُهَا))

(صحیح مسلم، کتاب المساجد)

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین جگہ مساجد ہیں اور ناپسندیدہ ترین جگہ بازار ہیں۔''

اسی طرح حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((خَيْرُ الْبِقَاعِ بُيُوتُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ)) (المعجم الاوسط للطبرانی' ح:۷۱۴۰)

''زمین میں سب سے بہتر جگہ اللہ کے گھر (مساجد) ہیں۔''

روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا گھر

مساجد روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں اور سب سے مبارک مقام بھی۔ اسلام میں مسجد کی بڑی عظمت اور اہمیت ہے' اس لیے کہ یہ اللہ عزّوجل کی بندگی' اُس کے ذکر اور قرآن مجید کی تلاوت کا مقام ہے۔ چنانچہ جس جگہ اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے' بندگی کے سجدے کیے جائیں اور اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے' اس جگہ سے بڑھ کر اور کون سی جگہ مقدس ہو سکتی ہے؟ جس طرح انسانوں کا نصیب ہوتا ہے اسی طرح زمین کے ٹکڑوں کا بھی نصیب ہوتا ہے اور زمین کے ہر ٹکڑے کا مقدر اللہ تعالیٰ کا گھر بننا نہیں ہے۔ اللہ زمین کے جس حصے کو چاہتا ہے' اپنا گھر بنانے کے لیے چن لیتا ہے' اور زمین کا وہ ٹکڑا عزّت' شرف اور عظمت حاصل کر لیتا ہے۔ حدیث مبارکہ میں ہے کہ ''جس طرح تم آسمان کے ستاروں کو چمکتا دمکتا دیکھتے ہو' آسمان والے زمین پر قائم مسجدوں کو اسی طرح روشن اور منوّر دیکھتے ہیں''۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسجدوں کی تعمیر کا کام انبیاء کرام ؊ سے لیا۔ قرآن

پاک میں خانہ کعبہ کے بارے میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اس کی تعمیر فرمائی۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰھٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَاِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾﴾ (البقرۃ)

”اور (وہ بھی کیا وقت تھا) جب ابراہیم خانہ کعبہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے' اور (ان کے ساتھ ان کے بیٹے) اسماعیل بھی تھے۔ (اور وہ دونوں ان الفاظ میں اللہ سے دعا کر رہے تھے:) اے ہمارے پالنے والے! ہم سے (اس خدمت کو) قبول فرما لے! بے شک تُو (ساری فریادیں) سننے والا (اور فریاد کرنے والے انسانوں کے حالات) جاننے والا ہے۔“

چنانچہ کعبۃ اللہ کو دُنیا کی پہلی مسجد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذریعے مسجد اقصیٰ کی تعمیر ہوئی' اور کائنات کے سب سے عظیم پیغمبر اور نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد مسجد نبوی کی بنیاد رکھی اور اس مسجد کی تعمیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ حضور اکرم ﷺ خود بھی شریک ہوئے۔ چنانچہ تعمیر کے وقت خود آپ ﷺ بھی پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ آپؐ زحمت نہ فرمائیں' مسجد کی تعمیر کے لیے ہم کافی ہیں' اس پر حضور اکرم ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی کہ ”جس طرح تم اجر کے محتاج ہو' مَیں بھی اللہ کے اجر کا محتاج ہوں۔“

سابقہ اُمتوں میں مساجد کا مقام

سابقہ اُمتوں میں بھی مساجد کا مقام بہت بلند تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو مسجد الحرام کی صفائی ستھرائی کا حکم دیا:

﴿وَعَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰھٖمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَالۡعٰکِفِیۡنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۱۲۵﴾﴾ (البقرۃ)

”ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے وعدہ لیا کہ تم میرے گھر کو طواف اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو گے۔“

جنابِ عمران کی اہلیہ نے بھی اپنے نومولود کی مسجد اقصیٰ کی خدمت کے لیے نذر مانی تھی:

﴿رَبِّ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لَکَ مَا فِیۡ بَطۡنِیۡ مُحَرَّرًا﴾ (آل عمران: ۳۵)

”پروردگار! مَیں نے نذر مانی ہے کہ جو کچھ میرے بطن میں ہے وہ (مسجد اقصیٰ کی خدمت کے لیے) آزاد ہے۔“

مسجد کی تاریخ

مسجد کی تاریخ معلوم کرنے کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے کہ مسجد دُنیا میں اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر ہے اور دُنیا کی آبادی کی ابتدا مسجد سے ہی ہوئی۔ تعمیرِ انسانیت کا پہلا شاہکار ہونے کا شرف اسی مسجد کو حاصل ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے' اور اس مبارک مقام کو برکت اور ہدایت کا مرکز بنا دیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس بات کو صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے' فرمایا:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۹۶﴾﴾ (آل عمران)

”بے شک وہ پہلا گھر جسے لوگوں کے (عبادت کرنے کے) لیے بنایا گیا' وہ بکّہ (مکّہ مکرمہ) میں ہے' مبارک ہے اور دونوں جہانوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے۔“

اللہ تعالیٰ کے فرستادہ بندے جہاں کہیں گئے' سب سے پہلے انہوں نے وہاں مسجد کی بنیاد رکھی یا رکھنے کی ترغیب دی' چاہے وہ پہلے نبی حضرت سیدنا آدم علیہ السلام ہوں یا آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ' تمام برگزیدہ ہستیوں نے مساجد کو تعمیر کیا۔ بلکہ اگر تاریخ مکّہ اور تاریخ کعبہ کو دیکھا جائے تو صرف خانۂ کعبہ کی تعمیر دس مرتبہ ہوئی ہے' جن میں سب سے پہلی تعمیر فرشتوں کی ہے جو انہوں نے ٹھیک بیت المعمور کے مدِّمقابل کعبۃ اللہ کی تعمیر کی' جسے عبادت کے لیے بنایا گیا۔

رسول اللہ ﷺ نبوت ملنے کے بعد جب تک مکہ مکرمہ میں رہے' مسجد حرام میں نمازیں ادا کیا کرتے تھے' کیونکہ مسجد پہلے سے بنی تھی اور بنانے والے بھی نبی تھے۔ مسجد حرام کو سب سے پہلے بنانے والے ابوالانبیاء سیدنا آدم علیہ السلام تھے' ان کے بعد حضرت شیث علیہ السلام اور پھر ان کے بعد حضرت سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے ہی ایک جگہ آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قیام فرمایا تو اسی دوران آپ ﷺ نے سب سے پہلی مسجد کی بنیاد رکھی' جسے آج ”مسجد قباء“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ مسجد بنانے کے بعد جب آپ ﷺ مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں بھی آپ ﷺ نے پہنچ کر جو سب سے اہم کام کیا وہ مسجد کے بنانے کا ہی تھا' جس کی تعمیر میں خود آپ ﷺ باقاعدہ شریک ہوئے۔ اس طرح مسجد قباء کو محمد رسول اللہ ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے بننے والی پہلی

مسجد کا شرف ملا اور مسجد نبوی شریف کو مدینہ منورہ میں بننے والی پہلی مسجد کا اعزاز حاصل ہوا۔

اس سے بڑھ کر مسجد کی تاریخ کو کیا بیان کیا جائے‘ جسے دُنیا میں اوّلیت کا شرف حاصل ہو‘ جس سے دُنیا کی تعمیرات کی ابتدا کی گئی ہو‘ بلکہ بعض روایات کے مطابق جس کی ابتدا فرشتوں کے ذریعے کروائی گئی ہو‘ جس سے نظامِ دُنیا کی بساط بچھائی گئی ہو‘ اس سے عظیم تر کوئی چیز کیسے ہوسکتی ہے؟ اس سے قدیم ہونے کا دعویٰ کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟

حضرت ابوذر غفاری ؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ کون سی مسجد سب سے پہلے بنائی گئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’مسجدِ حرام‘‘۔ میں نے عرض کیا پھر؟ تو فرمایا: ’’مسجدِ اقصیٰ!‘‘

مساجد اللہ کی ملکیت ہیں!

اسلام میں مساجد کو خصوصی حیثیت حاصل ہے‘ کیونکہ کسی زمین کو مسجد کے لیے وقف کرنا‘ اس حصۂ زمین کو براہِ راست اللہ کے حوالہ کر دینا ہے‘ اب گویا وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝۱۸﴾ (الجن)

’’بے شک مسجدیں اللہ کے لیے ہیں‘ اس لیے (مساجد میں) اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔‘‘

اس آیت میں مسجد کے بجائے ’’مساجد‘‘ یعنی واحد کے بجائے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے‘ یعنی جو حکم بیان کیا جا رہا ہے وہ کسی ایک مسجد کا نہیں ہے‘ بلکہ تمام مساجد کا ہے۔ اسی لیے مشہور مفسرِ قرآن حضرت عکرمہؒ نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت تمام مساجد کے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے۔ (مختصر تفسیر ابن کثیر: ۳/۵۸۶)

مذکورہ بالا آیت میں ایک بات یہ بیان کی گئی کہ مسجدیں اللہ ہی کی ملکیت ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی واضح فرما دی کہ مسجد کے اللہ کی ملکیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ جگہ ہمیشہ کے لیے اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ﴾ (البقرۃ:۱۱۴)

’’اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مساجد میں اللہ کا نام لینے سے روک دے اور اس کو ویران کرنے کے درپے ہو!‘‘

اس آیت میں بھی مساجد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اور جو جگہ اللہ کی عبادت کے لیے بنائی گئی ہو‘ اس میں اللہ کی عبادت کے روک دینے کو بہت بڑا ظلم قرار دیا گیا ہے۔ یہ آیت اگرچہ مسجد حرام سے متعلق نازل ہوئی ہے‘ لیکن جمع کے صیغہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمام مساجد کا یہی حکم ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۲/۵۳‘ نیز دیکھیے: تفسیر طبری: ۱/۳۵۲) اسی لیے قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فرمایا کہ ’’اگرچہ یہ آیت ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی ہے‘ لیکن یہ حکم عام ہے‘‘۔ (تفسیر مظہری: ۱/۱۱۶) --- آیت میں مذکور مسجد کو ویران کرنے سے مراد اس کو منہدم کرنا یا اس میں عبادت کو روک دینا ہے۔ (تفسیر ابی السعود: ۱/۱۴۹)

مساجد کی شرعی حیثیت

مساجد کی شرعی حیثیت کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے بھی روشنی ملتی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’زمین میں مساجد اللہ کے گھر ہیں اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے کہ جو اللہ کے گھر کی زیارت کرے‘ اللہ تعالیٰ اس کا اکرام فرمائے‘‘۔ (معجم طبرانی کبیر‘ کتاب الصلاۃ‘ باب لزوم المساجد)

اس حدیث میں مسجدوں کو اللہ تعالیٰ کا گھر قرار دیا گیا ہے‘ اس کا مطلب ظاہر ہے کہ مسجدیں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب انسان اس کا مالک و مختار نہیں ہے تو اس کو اس میں کسی تصرف اور اس کی حیثیت اور کیفیت کو بدلنے کا حق کس طرح ہوسکتا ہے؟

مسلمانوں کے مساجد سے وابستہ مفادات

مسلمانوں کے مساجد سے وابستہ مفادات دو طرح کے ہیں: دنیوی اور اخروی۔ دنیوی مفادات بھی دو قسم کے ہیں: اجتماعی اور انفرادی۔ انسان کے دونوں قسم کے مفادات کا تعلق مسجد سے ہی ہے‘ چاہے اس کی بیداری ہو یا اس کا اپنے رب کے حضور سربسجود ہونا‘ اس کا اجتماعی جگہوں میں شریک ہونا ہو یا اس کا کسی کی غم خواری و ہمدردی کرنا‘ اس کے مسائل کا حل ہو یا اس کے اعتکاف و مناجات۔ اُمّتِ مُسلمہ کے بہت سارے دینی و دنیوی مفادات مساجد سے ہی وابستہ ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ مساجد کو آباد کرنے والے کامیاب رہے اور اسے ویران کرنے یا ویرانی کی کوشش کرنے والے تباہ و برباد ہوئے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ مساجد کی تعمیر کی توفیق ہر فرد کو نہیں ہوتی‘ نہ اس کی خدمت کا موقع ہر ایک کو دیا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر وخدمت کا کام انبیائے کرام علیہم السلام اور خصوصاً دین ابراہیمی کا خاصہ رہا ہے۔ اس خدمت وتعمیر کا صلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امامت کی صورت میں دیا گیا ہے۔

مسجد زمین کا وہ حصّہ ہے جو اللہ ربّ العزت کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ اور یہ وہ جگہ ہے جس میں شاہ وگدا سب برابر ہیں۔ جس کی عظمت واحترام کا حال یہ ہے کہ ناپاکی کی حالت میں اس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ یہ الفت ومحبّت کا درس دیتی ہے اور باہمی بھائی چارہ اور اخوت کا مظہر ہے۔ جس کی طرف چلنا ایمان کی علامت اور اس سے روکنا کفر وعصیان اور ظلم کی علامت ہے۔ جسے آباد رکھنا تقویٰ والوں کا اور جسے ویران کرنا فساق وفجار کا کام ہے۔ جس کی صفائی وپاکیزگی انبیاء کرام علیہم السلام کا اور اسے گندا کرنا مشرکین اور ان کے حواریوں کا کام ہے۔ اسے تعمیر کرنا مسلم حکمرانوں کا اور اسے منہدم ومسمار کرنا اللہ کے نافرمانوں کا شیوہ رہا ہے۔ اسے ذکر وفکر اور علمی مجالس سے آباد کرنا مسلمانوں کا اور اسے کلیساؤں‘ تفریح گاہوں‘ چراہ گاہوں میں بدلنا یہود ونصاریٰ اور ان کے پیروکاروں کا وطیرہ رہا ہے۔

مساجد کی اہمیت: قرآن کریم کی روشنی میں

مسجد صرف ایک عمارت یا اس کے درو دیوار کا نام نہیں ہے‘ بلکہ مسجد وہ نظام عالم ہے جو سرور کونین ﷺ نے اس اُمت کو دیا ہے۔ مساجد مسلمانوں کا صرف مذہبی ہی نہیں‘ بلکہ معاشرتی‘ تعلیمی اور سیاسی مراکز بھی ہیں۔

قرآن کریم کی وہ آیات جن کا مسجد اور اس کے بنیادی اہداف ومقاصد کے بیان سے تعلق ہے‘ وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مساجد توحید خداوندی اور اسلام کی دعوت کے مراکز ہیں‘ اور دین میں اخلاص پیدا کرنے کا سرچشمہ ہیں۔ نیز ان کی آبادی اللہ کے ذکر‘ نماز اور عبادت سے ہوتی ہے۔ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿١٨﴾﴾ (الجن)

’’اور یہ کہ مساجد اللہ کی یاد کے واسطے ہیں‘ سو مت پکارو (ان میں) اللہ کے ساتھ کسی کو۔‘‘

یہ آیت مسجد میں توحید کا پرچار کرنے اور مساجد کو ہر نوع کے شرک سے دور رکھنے کی ہدایت کرتی ہے۔ اللہ جل شانہٗ کا ایک اور فرمان ہے:

﴿وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۭ﴾ (الاعراف: ۲۹)

’’اور سیدھے کرو اپنے چہرے ہر نماز کے وقت اور پکارو اللہ کو خالص اُس کے فرمانبردار ہو کر۔‘‘

یہ ارشاد مساجد میں اخلاص کے ساتھ عبادت کرنے اور اخلاص کے منافی ہر عمل سے بچنے کی ہدایت دیتا ہے۔ سورۃ النور میں فرمایا:

﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ﴾ (آیت ۳۶)

’’اُن گھروں میں جن کے بلند کیے جانے اور ان میں اپنے نام کے ذکر کیے جانے کا اللہ نے حکم دیا۔‘‘

جمہور مفسرین کی رائے کے مطابق یہ آیت مساجد کے مقاصد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

مساجد کے فضائل واہمیت: احادیثِ رسول ﷺ کی روشنی میں

مسجد کو مسلمانوں کے مرکز ہونے کا شرف حاصل ہے‘ اس کی مرکزیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کی مرکزیت کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس مرکزیت کو اگر کوئی ختم کرنا بھی چاہے تو وہ ناکام ونامراد ہی ہوگا اور اس کی مرکزیت کو ختم نہیں کر سکے گا۔ اس مرکزیت کی بنیاد پر مساجد کے بنانے کی ترغیب دی گئی‘ اس کی طرف جانے کی‘ اس میں بیٹھے رہنے کی‘ اس کے ساتھ دلی تعلق قائم کرنے کی‘ اس کی خدمت وصفائی کی‘ اس میں اذان دینے‘ نماز پڑھنے پڑھانے کی‘ اس کے ساتھ دل معلّق رہنے کی‘ اس کی طرف چل کر جانے کی اور اسے آباد رکھنے کی اس قدر روایات ہیں جو دینی شغف رکھنے والے مسلمانوں کے لیے محتاجِ بیان نہیں ہیں‘ اور انہیں اگر جمع کیا جائے تو مستقل کتاب کی شکل اختیار کر جائے۔

مساجد بنانا عبادت اور انبیاءِ کرام علیہم السلام کی مبارک سُنّت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسجد بنانے والے سے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((مَنْ بَنٰى مَسْجِدًا يَبْتَغِي بِهِ وَجْهَ اللّٰهِ عَزَّوجل بَنَى اللّٰهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ))
(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ)

''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے مسجد بنائی‘ اللہ تعالیٰ اس کا گھر جنت میں بنائے گا۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں‘ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا، صَغِيْرًا كَانَ أَوْ كَبِيْرًا، بَنَى اللّٰهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ))
(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْ يَعْلٰى)

''جس نے اللہ تعالیٰ (کی رضا) کے لیے چھوٹی یا بڑی مسجد بنائی‘ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنّت میں گھر بنائے گا۔''

ایک حدیث کی رو سے جو شخص پرندے کے گھونسلے کے برابر بھی مسجد کی تعمیر میں حصّہ لے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنّت میں گھر بنائے گا۔ چنانچہ یہ صرف ترغیب نہیں‘ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے مساجد تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے اور مسجد کی تعمیر میں خود شریک ہو کر اس کی فضیلت کو عملی طور پر بھی بیان کیا اور اس میں کام کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کپڑوں سے خود گرد و غبار بھی جھاڑتے رہے۔ آپ ﷺ کا یہ عمل مسجد کی خدمت کرنے والوں کے لیے تاقیامت ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

اور یہ سب کچھ کیوں نہ ہوتا؟ جب کہ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا: ''زمین کے حصوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ جگہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں مساجد اور بدترین جگہیں بازار ہیں۔'' اور یہ بھی بتا دیا کہ ''قیامت کے دن سات لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سائے میں جگہ عطا فرمائے گا جس روز اُس کے سائے کے علاوہ کوئی اور سایہ نہیں ہوگا۔ ان میں سے ایک وہ ہے: ((وَرَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ)) ''وہ شخص جس کا دل مساجد کے ساتھ معلق رہے۔'' (متفق علیہ)

امام ابوبکر احمد بن عمرو البزارؒ (متوفی ۲۹۲ھ) کی نقل کردہ روایت کے مطابق تو مسلمان کی بیٹھک مسجد میں ہی ہونی چاہیے‘ کیونکہ جو لوگ مساجد میں رہتے ہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو پُل صراط پار کرانے کی ضمانت دیتے ہیں۔

مساجد سے محبّت

مساجد سے محبّت رکھنا‘ ان کو آباد رکھنے کی فکر کرنا اور ان میں اعمالِ خیر انجام دینا مسلمانوں کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ مساجد سے محبّت ایمان کی نشانی ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ

روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ يَعْتَادُ الْمَسْجِدَ، فَاشْهَدُوْا لَهُ بِالْإِيْمَانِ. قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ [التوبة:١٨])) (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالترمِذِيُّ وَقَالَ: حَدِيْثٌ حَسَنٌ)

''جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد میں آنے جانے کا عادی ہے تو اس کے ایمان کی گواہی دو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اللہ کی مساجد کو صرف وہی شخص آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لایا۔''

مسجد سے جڑے ہوئے چھوٹے سے چھوٹے عمل پر بھی اجر و ثواب رکھا گیا ہے‘ چنانچہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے: ''میری اُمّت کے اعمال میرے سامنے پیش کیے گئے تو مَیں نے دیکھا کہ میری اُمّت کے کسی فرد نے مسجد سے تنکا اٹھا کر باہر ڈال دیا‘ اس کا اجر بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھ دیا گیا۔'' (ابوداوٗد و ترمذی)

مساجد کی طرف اُٹھنے والے قدم

مساجد کی طرف پیش قدمی کے لیے اُٹھنے والے ہر قدم کے بدلے ایک درجے کی بلندی اور ایک خطا کی معافی کا وعدہ کیا گیا ہے‘ ہر صبح و شام مسجد کی طرف جانے کے بدلے جنت میں صبح و شام کی خاص مہمان نوازی کا اعلان کیا گیا ہے‘ جیسا کہ صحیح حدیثِ مبارکہ میں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ غَدَا إِلَى الْمَسْجِدِ وَرَاحَ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُ نُزُلَهُ مِنَ الْجَنَّةِ كُلَّمَا غَدَا أَوْ رَاحَ)) (متفق علیه)

''جو شخص صبح کو اور شام کو مسجد کی طرف جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں مہمان نوازی کا سامان (ہر مرتبہ) تیار کر دیتا ہے جب بھی وہ صبح یا شام کے وقت جاتا ہے۔''

((مَنْ تَوَضَّأَ وَجَاءَ إِلَى الْمَسْجِدِ فَهُوَ زَائِرُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَحَقٌّ عَلَى الْمَزُوْرِ أَنْ يُكْرِمَ الزَّائِرَ)) (الصحيحة للالبانی:١١١٩)

''جو شخص وضو کرے اور مسجد کی طرف آئے تو وہ اللہ عزّوجل کا مہمان ہے، اور میزبان (اللہ تعالیٰ) پر یہ حق ہے کہ وہ مہمان کا اکرام کرے۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہوتا ہے تو جب تک وہ اپنے مصلّے پر باوضو رہے فرشتے اس کے لیے یوں

دعا کرتے رہتے ہیں: ''اے اللہ! اس کی مغفرت فرما' اے اللہ! اس پر رحم فرما''۔ (متفق علیہ)

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو خوب چرو''۔ سوال کیا گیا کہ جنت کے باغ کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مساجد۔'' (سنن الترمذی)

ذکر اور علم کے ذریعے مساجد کی آباد کاری

نبی کریم ﷺ نے مساجد کی آباد کاری کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

((إِنَّمَا هِيَ لِذِكْرِ اللهِ عزَّ وجلَّ وَالصَّلَاةِ وَقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ)) (متفق علیہ)

''بے شک! مساجد تو ذکرِ الٰہی' نماز اور تلاوتِ قرآن کے لیے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے مساجد کو نیکیوں سے آباد کرنے والوں کی تعریف فرمائی اور یہ اعزاز بخشا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دُنیا کے فتنے سے محفوظ فرما لیا ہے:

﴿يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝۳۶ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝۳۷﴾ (النور)

''ان (مساجد) میں یہ لوگ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت ذکرِ الٰہی' نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتی۔ وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن قلوب اور نظریں پھر جائیں گی۔''

بلکہ ان کے لیے مؤمن اور ہدایت یافتہ ہونے کی گواہی بھی دی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ ۫ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝۱۸﴾ (التوبۃ)

''اللہ کی مساجد کو آباد کرنا تو اس کا کام ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے' نماز قائم کرے' زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ امید ہے کہ ایسے ہی لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے۔''

فرشتے بھی مساجد میں آتے ہیں اور خطبہ سنتے ہیں' نیز مساجد میں قائم ہونے والی علمی و فکری مجالس کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے کسی گھر میں لوگ جمع ہوں' قرآن مجید کی تلاوت کریں اور اس کا باہمی مذاکرہ کریں تو ان پر سکینت

نازل ہوتی ہے' انہیں رحمتِ خداوندی ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں' نیز اللہ تعالیٰ ان کا اپنے ہاں تذکرہ فرماتا ہے۔ (رواہ مسلم)

مساجد مسلمانوں کے لیے اعزاز' باعث شرف اور دینی شعائر ہیں۔ مساجد کو نمازوں اور ذکرِ الٰہی کے ساتھ آباد کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ رفعت اور سعادت سے نواز کر ان کو شرحِ صدر فرما دیتا ہے۔ مساجد میں قرآن و سُنّت کی تعلیم مساجد کی آباد کاری کے لیے حکمِ ربانی کی تعمیل ہے' اس سے احیائے سُنّت نبوی ﷺ کے ساتھ وقت اور عمل میں برکت ہوتی ہے اور انسان خود کو اور اپنی اولاد کو بہتری کی جانب گامزن کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص مساجد کی خیر سے محروم ہے یا اس خیر میں رکاوٹ بنتا ہے تو وہ بہت سی فضیلتوں سے محروم ہے۔

باہمی الفت اور اتحاد کی فضا پیدا کرنا مساجد کے اہداف میں سے ہے' اس لیے مساجد کو گروہ بندی اور اختلاف کا ذریعہ بنانا جائز نہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ﴾ (التوبۃ:۱۰۷)

''اور وہ لوگ جنھوں نے مسجد بنائی تکلیف دینے اور کفر پھیلانے اور ایمان والوں کے درمیان تفریق ڈالنے کے لیے اور گھات لگانے کے لیے' جنھوں نے اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے لڑائی کی (وہ یقیناً خسارے میں ہیں) اور یقیناً وہ ضرور قسمیں اٹھائیں گے کہ ہم نے بھلائی کے سوا کچھ ارادہ نہیں کیا۔''

اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ

یہ حقیقت بھی سمجھنے کی ہے کہ مسجد صرف عبادت اور بندگی کے لیے نہیں ہے' یہاں سے انسانیت کو اور مسلمانوں کو زندگی گزارنے کے سلسلے میں رہنما ہدایات حاصل ہوتی ہیں۔ مساجد اللہ تعالیٰ کی توحید کے اعلان اور بیان کا مرکز ہیں' یہاں سے بار بار یہ صدا بلند ہوتی ہے کہ اللہ سب سے بڑا ہے' اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ مساجد میں نہ تو کوئی تصویر ہوتی ہے اور نہ نمازیوں کے آگے کوئی مجسمہ' وہ صرف ایک اللہ کے آگے جھکتے ہیں' اور اسی کے آگے جھکنے کو اپنی عزّت تصوّر کرتے ہیں۔ مساجد سے مساوات کا بھی درس ملتا ہے کہ دُنیا کے سب انسان برابر ہیں' کسی کو کسی پر سوائے تقویٰ کے کوئی برتری حاصل نہیں۔ مساجد کی صفوف میں امیر اور غریب میں کوئی فرق

نہیں ہوتا۔ بڑے سے بڑا عالم نماز پڑھ رہا ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے دائیں بائیں کوئی جاہل کھڑا نہ ہو۔ مسجد میں آنے کے بعد سارے فرق مٹ جاتے ہیں اور دُنیا کو یہ درس ملتا ہے کہ مسجد اسلام کی اس تعلیم کا عملی نمونہ ہے کہ ''کسی عربی کو کسی عجمی پر' کسی عجمی کو کسی عربی پر' کسی کالے کو کسی گورے پر' اور کسی گورے کو کسی کالے پر' سوائے تقویٰ کے' کوئی برتری حاصل نہیں''۔ اسی طرح مسجد سے طہارت و نظافت' صفائی اور پاکیزگی' وقت کی پابندی اور منظم زندگی کا بھی درس ملتا ہے۔

مساجد میں حصولِ علم

مساجد میں حصولِ علم متاعِ دُنیا سے افضل ہے' رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''تم میں سے کوئی مسجد جا کر علم حاصل کیوں نہیں کرتا یا قرآن کریم کی دو آیتیں ہی کیوں نہیں پڑھتا؟ یہ دو آیتیں اس کے لیے دو اونٹنیوں سے بہتر ہیں' تین آیات تین اونٹنیوں سے بہتر ہیں' چار آیات چار اونٹنیوں سے بہتر ہیں' جتنی آیات اتنی ہی اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔'' (رواہ مسلم)

نبی مکرم ﷺ نے اپنی مسجد کو تعلیم کے لیے استعمال کیا' جس کے نتیجے میں ایسی کھیپ تیار ہوئی' جس کا ثانی نہ کوئی تھا اور نہ ہی ہوگا۔ آپ ﷺ مسجد نبوی میں علم اور ذکر کے حلقوں میں شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔

مسجد کی خدمت کرنے والے کا مقام

اسلام نے خادمِ مسجد کی بڑی عزّت افزائی فرمائی ہے۔ چنانچہ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے مسجد میں جھاڑو دینے والی خاتون کے بارے میں استفسار کیا اور صحابہ کرام ؓ نے بتایا وہ تو فوت ہوگئی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس کی قبر بتلاؤ''۔ صحابہ کرام ؓ نے آپ ﷺ کو ان کی قبر بتلادی' تو نبی ﷺ نے وہاں جا کر ان کا جنازہ پڑھا۔ (رواہ البخاری)

مسجد میں داخل ہونے والے کے لیے عظیم بشارتیں

مسجد میں داخل ہونے والے مسلمان کے لیے ثواب اور اجر عظیم کی بشارتوں کے سلسلے میں کئی روایات منقول ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان عالی شان ہے:

''مسجد جانے والے کے لیے ہر قدم کے بدلے میں نیکی ہے' اللہ تعالیٰ اس کا ایک درجہ بلند اور اس کی ایک برائی مٹا دیتا ہے۔'' (رواہ مسلم)

بلکہ مسجد سے واپس گھر آتے ہوئے بھی اسی طرح نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ ایک آدمی نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا مسجد جانا اور مسجد سے واپس گھر آنا دونوں ہی بطور ثواب لکھا جائے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ سب کچھ لکھ دیا ہے۔'' (رواہ مسلم)

''مساجد کی جانب زیادہ سے زیادہ چل کر جانا اور مساجد میں نمازوں کا انتظار کرنا رباط (راہِ الٰہی میں پہرہ دینے) کے مترادف ہے۔ جو شخص صبح کے وقت مسجد جائے یا شام کے وقت' وہ جب بھی صبح یا شام کو مسجد جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں مہمان نوازی کی تیاری فرماتا ہے''۔ (متفق علیہ)

''نماز کے لیے جو جتنا دُور سے چل کر آئے گا' اس کا اجر بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا' اور امام کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لیے انتظار کرنے والے کا اجر اس شخص سے زیادہ ہے جو (تنہا) نماز پڑھ کر سو جائے۔'' (متفق علیہ)

مساجد کی جانب چل کر جانا بھی گناہوں کی بخشش کا باعث ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو شخص نماز کے لیے اچھی طرح وضو کرے' پھر فرض نماز ادا کرنے کے لیے چلے' پھر لوگوں کے ساتھ یا جماعت کے ساتھ یا مسجد میں (جماعت ہو چکی ہو تو اکیلے) نماز ادا کرے تو اللہ تعالیٰ اُس کے گناہ بخش دیتا ہے۔'' (رواہ مسلم)

''مسجد میں داخل ہونے کے بعد مسلمان اس وقت تک نماز کی حالت میں ہوتا ہے جب تک نماز اسے مسجد میں روکے رکھے' اور جب تک وہ اپنی جائے نماز پر بیٹھا رہے تو اس کے لیے فرشتے دعائیں کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''یا اللہ! اسے بخش دے' یا اللہ! اس پر رحم فرما۔'' (صحیح البخاری)

روح کی تسکین کا مقام

مساجد میں روح کو سکون اور چین ملتا ہے' اس لیے مساجد میں چیخنا چلّانا' لڑائی جھگڑا کرنا یا شور مچانا جائز نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''مسجد میں اپنے آپ کو بازاری شور سے بچاؤ۔'' (مسلم) یہی وجہ ہے کہ جس وقت حضرت عمر فاروق ؓ نے کچھ لوگوں کو مسجد میں آواز بلند کرتے ہوئے سنا تو انہیں بلا کر فرمایا: ''اگر تم یہاں کے رہائشی ہوتے تو سخت سزا دیتا' تم رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں آوازیں بلند کرتے ہو!'' (رواہ البخاری)

مساجد امن و سکون اور اطمینان کی جگہیں ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو بھی ہماری مسجد

یا بازار میں نیزہ لے کر گزرے تو وہ اس کے پھل سے پکڑ لے تاکہ وہ کسی مسلمان کو زخمی نہ کردے۔'' (متفق علیہ)

مسجد میں عبادت کرنے والے کی اتنی شان ہے کہ اسے چھو کر بھی اذیت دینا جائز نہیں۔ چنانچہ ایک شخص جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے آیا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا: ''بیٹھ جاؤ! تم ایذا پہنچا رہے ہو۔'' (رواہ ابوداؤد) بلکہ بدبو سے بھی مسجد میں عبادت کرنے والے کو تکلیف دینا جائز نہیں۔ آپ ﷺ نے ایسے شخص کو بطورِ سزا مسجد میں جانے سے روک دیا جس سے بدبو آ رہی ہو۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو شخص لہسن یا پیاز کھائے تو وہ ہم سے دور رہے یا ہماری مسجد سے دور رہے اور گھر بیٹھا رہے۔'' (متفق علیہ) ابن اثیرؒ کے مطابق: ''یہ ممانعت بطور عذر نہیں، بلکہ مسجد سے دوری کا حکم بطورِ سزا ہے۔''

مساجد راحت وسکون اور آخرت کو یاد کرنے کی جگہیں ہیں، یہاں پر دُنیاداری سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط کیا جاتا ہے، اسی لیے مساجد میں خرید وفروخت منع ہے، بلکہ اس پر ڈانٹ بھی پلائی گئی ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

''جب تم کسی کو مسجد میں خرید وفروخت کرتے ہوئے دیکھو تو کہو: اللہ تمہاری تجارت میں نفع نہ دے''۔ (سنن الترمذی)

مزید برآں مساجد میں دُنیاوی پریشانیوں میں مشغول ہونے سے بھی روکا اور فرمایا:

''جو شخص مسجد میں کسی کو اپنی گم شدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے تو اُسے کہہ دے: اللہ تمہاری چیز نہ لوٹائے۔ مساجد اس لیے تو نہیں بنائی گئیں۔'' (رواہ مسلم)

مسجد کے آداب

مسجد میں آنے کے آداب میں یہ شامل ہے کہ اچھے لباس کے ساتھ آئیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ (الاعراف:۳۱)

''اے بنی آدم! جب بھی کسی مسجد میں جاؤ تو (لباس سے) آراستہ ہو کر جاؤ۔''

مسجد کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ مسجد میں آ کر سکون اور وقار کے ساتھ رہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جب نماز کی اقامت ہو جائے تو دوڑتے ہوئے مسجد میں نہ آؤ، بلکہ پُروقار انداز سے چلتے ہوئے آؤ، نماز کا جو حصہ مل جائے وہ پڑھ لو اور جو رہ جائے وہ بعد میں

پورا کر لو۔'' (متفق علیہ) جب مسجد میں داخل ہو تو مسجد کے احترام میں پہلے اپنا دایاں قدم اندر رکھے، اور چونکہ مسجد عبادت، رحمت اور دعا کی جگہ ہے اس لیے داخل ہوتے وقت کہے:

اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ ''یا اللہ! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے!''

اور جب مسجد سے باہر نکلے تو کہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ (مسلم) ''یا اللہ! مَیں تجھ سے تیرا فضل مانگتا ہوں۔''

اور مسجد میں اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک دو رکعت تحیۃ المسجد نہ پڑھ لے۔

مساجد، صراطِ مستقیم کا سرچشمہ

مساجد سعادت مندی اور صراطِ مستقیم کا سرچشمہ ہیں۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے مسجد میں نماز ادا کرتے۔ (بخاری)

ہر مسلمان کی اوّلین ذمہ داری ہے کہ صرف ایک اللہ کی بندگی کرے اور مسجد کے اندر یا مسجد سے باہر کہیں بھی اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پکارے۔ نیز مساجد زندہ لوگوں کے مستفید ہونے کی جگہ ہے۔ لہٰذا مساجد میں قبریں بنانا، اس مقصد کے منافی اور غیر اللہ کی بندگی کا ذریعہ ہے۔

گناہ ویسے تو ہر مکان و آن ہی برے ہوتے ہیں، لیکن مساجد میں غیبت، بدنظری اور موبائل وغیرہ سے گانے بجانے سننے پر گناہوں کی سنگینی مزید بڑھ جاتی ہے۔

شریعتِ اسلامیہ کا حسن

شریعتِ اسلامیہ کا یہ حسن ہے کہ اس کا پیش کردہ ہر نظام جس مرتب انداز پر اُستوار ہے، وہ خوبی وکمال کی اتنی نوعیتیں اپنے اندر سمویا ہوا ہے کہ انسانی عقل اس کے پیش کردہ نظام سے بہتر اور مکمل نظام کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ پنج گانہ نمازیں جو اُمت پر روزانہ فرض ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ان نمازوں کے مکمل ثمرات اور عمدہ برکات عظیم اجروثواب کی صورت میں یقیناً جنت میں ہی ملیں گی، جہاں کی نعمتیں بے مثل و بے نظیر ہیں۔

ہر نماز کے لیے اذان جیسے عظیم الشان مسنون عمل کے ذریعے لوگوں کو جمع کرنے کا حسین طریقہ مقرر کیا گیا، پھر ان نمازوں کے لیے خاص جگہیں ہیں، جن کا نام مساجد رکھا گیا۔ یومیہ پانچ مرتبہ لوگوں کا اس طرح جمع ہونا جہاں اُمّتِ مُسلمہ کے روحانی اجتماع کا باعث بنتا ہے، وہیں اس کے ذریعے باہمی تعارف، الفت ومحبّت اور افرادِ اُمّت کو ایک دوسرے سے قریب ہونے کا موقع بھی فراہم کیا گیا ہے۔

پھر اس پنج وقتہ اجتماع کے دائرے کو جامع مسجد کے ذریعے مزید وسعت دی گئی۔ شکرانے اور خوشی کے دو تہواروں یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے لیے کھلے میدان میں باجماعت نماز کا اجتماع مقرر کر کے اس دائرے کو مزید کشادہ کیا گیا' اور پھر ان تمام اجتماعات سے بڑھ کر حج بیت اللہ کا اجتماع مقرر کیا گیا۔ اگر اُمتِ مُسلمہ کی جانب سے کماحقہٗ قدردانی ہو تو شریعت کا عطا کردہ ہر نظام مسلمانوں میں دینی' اجتماعی اور ثقافتی روح بیدار کرنے کا بہترین ذریعہ ہے' اور اہلِ اسلام کو قدردانی پر آمادہ کرنا چنداں مشکل نہیں۔ یہ مقصد ترغیب وترہیب' وعظ ونصیحت اور قدردانی کرنے والوں کے اجرِ عظیم کا بار بار تذکرہ کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے' اور اس طرح شوق دلا کر اگر لوگوں کو عمل پر آمادہ کیا جائے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ جو شخص ان حقائق کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہو اور بلند کردار کا طالب ہو' وہ اُسے جاننے کے بعد بھی احکامِ اسلام کی پاسداری نہ کرے۔

جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی کے لیے ان بابرکت مساجد کا نظام ایسا ہے کہ انسانی عقل اس سے ارفع اور بہتر نظام کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس نظام کی مندرجہ ذیل بنیادی خصوصیات ملاحظہ کیجیے:

ایک شخص ایک سے زائد مرتبہ اللہ کی عظمت وجلالت اور اللہ کی توحید بیان کرتا ہے' اور حضور ﷺ کی نبوت ورسالت کا اعلان کرتا ہے' پھر لوگوں کو نماز کی دعوت دیتا ہے' جو ہر قسم کی ہدایت اور بھلائی کا منبع ہے' پھر اسی طرح اُخروی کامیابی کی دعوت بھی دیتا ہے' اور بقول علامہ راغب اصفہانیؒ: ''جس کامیابی کی بقا کو فنا کا' جہاں کی مالداری کو فقر کا' اور جہاں ملنے والی عزّت کو ذلّت کا کوئی اندیشہ نہیں' وہاں کا علم ہر جہل سے مبرا ہے۔'' (المفردات فی غریب القرآن' مادہ :فلح) اس پر مزید اضافہ کیجیے کہ وہاں کی راحت میں تکان کا گزر نہیں۔ اس جامع اور انوکھی دعوت کو دیکھیے' پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس آواز کو مسلمانوں کے گوش گزار کرنے کے لیے مینار اور محراب ومنبر جیسے وسائل کا انتخاب کیا گیا' جن میں آج کی سائنسی پیش رفت کے بعد لاؤڈ اسپیکر اور مائیک کا بھی اضافہ ہو چکا ہے۔ اس اہمیت کے ساتھ مسجد میں آنے کی دعوت خود ایک عجیب شان رکھتی ہے۔

مسجد' کتاب وسنّت کی تعلیم وتربیت کا مرکز

اسلام کی عظیم الشان تاریخ ہمیں مسجد نبوی میں حضور ﷺ کی حیات میں قائم ہونے والے دینی تعلیم کے حلقوں کا پتہ دیتی ہے۔ یہ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ فقراء اصحابِ صُفّہؓ

حضور ﷺ کے مقدّس کلام کو سننے اور یاد کرنے کے لیے جمع ہونے والا پہلا قافلۂ علم تھا۔ یہ حضرات مسجد نبوی اور صُفّہ ہی میں رہتے' تاکہ قرآن کی کوئی آیت جو بصورتِ وحی آپؐ پر نازل ہو یا آپ ﷺ کا کوئی فرمان گرامی سننے سے رہ نہ جائے۔ ان میں وہ قُرّاء کرام بھی تھے' جنہیں بئر معونہ پر رعل' ذکوان اور عصیہ نامی قبائل کے افراد نے دھوکہ سے شہید کیا' اور آپؐ نے ان قبائل کے خلاف ایک مہینے تک نمازِ فجر میں قنوتِ نازلہ کے ذریعے بددعا فرمائی۔ انہی اصحابِ صُفّہؓ میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارے میں حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:

''میں نے اصحابِ صفہؓ میں سے ستّر افراد ایسے دیکھے ہیں کہ ان میں سے کسی کے پاس تن ڈھانپنے کے لیے مکمل کپڑا نہ ہوتا تھا' ازار ہوتی یا بڑی چادر ہوتی' جس کو گردن پر باندھ لیتے' کسی کی یہ چادر نصف پنڈلی تک پہنچتی' کسی کی ٹخنوں تک پہنچتی' تو وہ اس چادر کو سمیٹ سمیٹ کر بیٹھ جاتے' مبادا ستر ظاہر ہو جائے۔'' (صحیح البخاری' کتاب الصلوٰۃ' باب نوم الرجال فی المسجد)

اصحابِ صُفّہؓ جو نبی کریم ﷺ کے شاگرد تھے' ان ہی میں سے ایک انتہائی باکمال اور باصلاحیت عبقری شخصیت حضرت ابوہریرہؓ کی تھی۔ آپؓ کا شمار حُفّاظِ حدیث صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ عہدِ نبوت کے صرف تین سالوں میں آپؓ نے علومِ حدیث کے وہ عظیم خزانے حاصل کیے جن کی کثرت نے ایک عالم کو انگشت بدنداں کر دیا۔ آپؓ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کردہ احادیث جو ہم تک پہنچی ہیں' ان کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتّر (۵۳۷۴) ہے۔ یہ ایک بڑی تعداد ہے اور ''صحیح بخاری'' کی مکررات کو حذف کر کے بقیہ روایات سے زیادہ ہے۔

صرف مسجدِ نبوی اور مسجدِ حرام ہی کیا' دُنیا میں جہاں کہیں بصرہ' کوفہ' بغداد' شام وغیرہ ممالک فتح ہوئے تو وہاں مساجد کی تعمیر عمل میں آئی۔ یہ مساجد درس وتدریس کے مراکز تھے جو بڑی بڑی جامع مساجد میں قائم تھے' گویا علم کے چشمے تھے جو اُبل پڑے تھے اور فراوانی سے بہہ رہے تھے۔ عراق کی فتح کے بعد جامع مسجد کوفہ سب سے پہلی مسجد تھی' جس کی بنیاد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے رکھی تھی۔ یہ مسجد احادیثِ نبویہ کی تعلیم کا مرکز تھی' جہاں براء بن عازبؓ پہلے صحابی تھے' جنہوں نے احادیثِ نبویہ کی تعلیم شروع فرمائی۔ اسی طرح بعد کے ادوار میں بھی مساجد دین کی درسگاہیں ہی ہوا کرتی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت قاہرہ کی جامع ازہر' تیونس کی جامع زیتونہ اور اندلس کی جامع قرطبہ کو حاصل ہوئی۔

ان کے علاوہ بھی کئی ایسی جامع مساجد تھیں جو کہ علوم اسلامیہ کی باقاعدہ یونیورسٹیاں تھیں‘ جن سے علم کے چشمے جاری تھے‘ جن سے نکلنے والی نہریں کُرّۂ ارض کے مختلف گوشوں میں پھیل چکی تھیں‘ اور ان نہروں سے چھوٹے بڑے سب ہی اہلِ علم مستفید ہو رہے تھے۔ ان تاریخی روایات کو مدّ ِنظر رکھ کر یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اسلامی سلطنت وسطوت کے زمانے میں عرب وعجم کے جس شہر میں بھی کوئی مسجد قائم ہوئی‘ وہ کتاب وسُنّت کی تعلیم کا مرکز رہی ہے۔

الغرض نمازوں کے اجتماعات کے ساتھ ساتھ یہ مساجد دراصل توحید کی طرف دعوت‘ تبلیغ دین‘ احکامِ شریعت کی تعلیم اور فکری تربیت ورہنمائی‘ قلبی اور روحانی اصلاح کا عنوان ہیں‘ جیسا کہ ماضی میں یہی مساجد قضاء‘ افتاء اور عدالتی فیصلوں کا بھی عنوان ہوا کرتی تھیں۔

دُعا ہے کہ اللہ تبارک ہماری مساجد کو حرمین شریفین خصوصاً مسجدِ نبوی کے دورِ اوّل کا حقیقی نمونہ بنا دے۔ آمین یا ربّ العالمین! ❁❁❁

بقیہ: احیائی مساعی اور تنظیم اسلامی

ٹارچ تنظیم اسلامی کے پاس امانت ہے۔ ہمیں اپنے مقام اور اپنے کام کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ کہیں ہمارا بھی وہ حال نہ ہو کہ آبِ حیات پاس ہے اور پیاس سے مر رہے ہیں۔ کوہِ نور کا ہیرا پاس ہو اور کانچ کے ٹکڑوں کے پیچھے بھاگتے رہیں۔ اس ضمن میں بانی تنظیم اسلامی عرشی بھوپالی کے یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:ے

ساتھیو! مشعلوں کو تیز کرو!
جنگ بازوں کا‘ ملک گیروں کا
موت کے سر پھرے نقیبوں کا
قافلہ تیز گام ہے کتنا
اور بھی قافلوں کو تیز کرو!

اور بقول علامہ اقبال ؒ ’’تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست!‘‘

اور یہ ہوگا دعوت سے‘ لہٰذا ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی دعوت تیز تر کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!!

اقول قولی ھذا واستغفراللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

فکرِ آخرت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

ہر انسان کی فطرت میں اچھائی اور بُرائی کی تمیز رکھی گئی ہے اور ہر انسان کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ برائی اختیار کرے یا بھلائی۔ چنانچہ یہاں لوگ برائیاں بھی کر رہے ہیں اور اچھے کام بھی۔ کوئی ایسا بھی ہے جو کسی دوسرے انسان کے مفاد کی خاطر اپنا نقصان برداشت کر لیتا ہے‘ کسی کی جان بچانے کے لیے اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتا‘ بھوکے پیاسے کو دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے اور اس کی بھوک پیاس مٹانے میں لگ جاتا ہے‘ راستے میں ایک نابینا سڑک پار کرنا چاہتا ہے ایک شخص اس کا بازو پکڑ کر سڑک پار کرا دیتا ہے‘ کہیں حادثہ ہو جائے تو زخمی کی مدد کر کے اسے ہسپتال پہنچانے کی کوشش کرتا ہے‘ کسی کا سامان اس کی سواری سے گر جاتا ہے تو دوسرا شخص اس کا سامان سواری پر رکھوا دیتا ہے۔ یہ سب بھلائی کے کام ہیں اور بھلائی کرنے والا اپنے دل میں خوشی محسوس کرتا ہے کہ میں نے کسی ضرورت مند کی مدد کی ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ اگر یہی پریشانی مجھے لاحق ہو جاتی تو میرا کیا حال ہوتا۔

اسی طرح ایک شخص ایسا ہے کہ دوسروں کا مال چھین لیتا ہے‘ اس کی جائیداد پر قبضہ کر لیتا ہے‘ کسی کی امانت واپس نہیں کرتا‘ کسی کمزور پر ظلم کرتا ہے‘ اپنے مخالف کا بدخواہ ہوتا ہے اور موقع پا کر اسے قتل بھی کر دیتا ہے‘ ایسا سنگ دل شخص ضرورت مندوں کی مدد نہیں کرتا بلکہ انہیں دکھ اور تکلیف میں دیکھ کر سمجھتا ہے کہ یہ تکلیف انہی کا حصّہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص یہ اچھے کام کرتا ہے اسے ان اچھے کاموں کا کوئی انعام یا صلہ نہیں ملتا بلکہ اکثر اوقات وہ کسی ناکردہ جرم کی سزا پا لیتا ہے‘ جبکہ برائیاں کرنے والوں کو اکثر نہ کوئی سزا ملتی ہے اور نہ ہی وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں‘ بلکہ غرور اور تکبر کے ساتھ کمزوروں کو اذیت پہنچانے میں لگے رہتے ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نیکی کرنے والے کو دنیا میں ہی اس کا اچھا بدلہ مل جاتا ہے اور ظالم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے‘ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں جو محض دنیا والوں کی عبرت کے لیے ہوتی ہیں۔ ہر صاحبِ عقل وشعور کا دل چاہتا ہے کہ اچھوں کو ہر اچھائی کا اور بُروں کو ہر بُرائی کا بدلہ ضرور ملنا چاہیے۔ چنانچہ اس کے لیے ’’بدلے کا دن‘‘ برپا کیا جائے گا جہاں اچھے کام کرنے والوں کو اعلیٰ سکون واطمینان کی لمبی زندگی ملے گی‘ جس میں وافر نعمتیں ہوں گی۔ بروں کو ان کی برائی کی سزا میں مبتلا کیا جائے گا۔

اسی حقیقت کو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً: ﴿فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ﴿٧﴾ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ﴿٨﴾﴾ (الزلزال) ’’(فیصلے کے دن) جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا‘‘۔ قیامت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُہٗ ﴿٦﴾ فَہُوَ فِیۡ عِیۡشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ ﴿٧﴾ وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُہٗ ﴿٨﴾ فَاُمُّہٗ ہَاوِیَۃٌ ﴿٩﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا ہِیَہۡ ﴿١٠﴾ نَارٌ حَامِیَۃٌ ﴿١١﴾﴾ (القارعة) ’’جس کے (اعمال کے) وزن بھاری نکلیں گے‘ وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔ اور جس کے وزن ہلکے نکلیں گے‘ اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہے۔ تم کیا سمجھے کہ وہ ہاویہ کیا چیز ہے؟ وہ دہکتی ہوئی آگ ہے۔‘‘ مزید فرمایا: ﴿اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ﴿١٣﴾ وَاِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِیۡ جَحِیۡمٍ ﴿١٤﴾﴾ (الانفطار) ’’بے شک! نیکوکار نعمتوں (کی بہشت) میں ہوں گے اور بدکردار دوزخ میں۔‘‘

فیصلے کے اس دن کو ’’یوم الدین‘‘ کہا گیا ہے جس دن دنیا کی زندگی کے اعمال کی اچھی بری جزا ملے گی۔ اس دن فیصلہ اللہ تعالیٰ کریں گے اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہوگی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ﴿١٧﴾ ثُمَّ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ﴿١٨﴾ یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡئًا ؕ وَالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ ﴿١٩﴾﴾ (الانفطار) ’’اور تمہیں کیا معلوم جزا کا دن کیسا ہے۔ پھر تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے! جس دن کوئی کسی کا بھلا نہ کر سکے گا‘ اور حکم اس روز اللہ ہی کا ہو گا۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ﴿١٤﴾﴾ (التکویر) ’’(قیامت کا دن وہ ہوگا کہ) ہر شخص معلوم کر لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔‘‘ چونکہ وہ سچا فیصلے کا دن ہوگا لہٰذا کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا‘ ہر ایک کو اکیلے اکیلے

حساب دینا ہوگا‘ کسی متقی کے بیٹے کو اس کے باپ کا تقویٰ فائدہ نہ دے گا اور نہ ہی فاسق و فاجر کے بیٹے کو اس کے باپ کے فسق و فجور کی بنا پر سزا دی جائے گی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿یَوۡمَ یَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِیۡهِ ﴿۳۴﴾ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیۡهِ ﴿۳۵﴾ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیۡهِ ﴿۳۶﴾﴾ (عبس)

’’اُس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا‘ اور اپنی ماں اور باپ سے‘ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹے سے۔‘‘ گویا ہر شخص کو اپنی فکر ہوگی۔ وقوعِ قیامت کی اس قدر وضاحت اور نیکی و بدی کے کاموں کی جزا و سزا کا یہ بیان انتہائی واضح ہے۔ اس کے باوجود اس مسلمان پر تعجب ہے جو قرآن مجید کو اللہ کی کتاب مانتا ہے‘ اس کے فیصلے اور بیانات کو حتمی سمجھتا ہے اور پھر وہ برائی کے کاموں پر دلیر ہے۔ انسان کی زندگی امتحان کا وقفہ ہے کہ دیکھیں کون بُرے کاموں میں پڑ کر یہ زندگی گزارتا ہے اور کون اچھے کام کرتا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک: ۲) ’’اُس نے زندگی اور موت کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون بھلے کام کرتا ہے۔‘‘

شیطان انسان کا دشمن ہے‘ اُس نے دھوکہ دیا اور آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوا دیا۔ اب وہ اولادِ آدم کو برائیاں مزین کر کے دکھلاتا ہے اور انسان کو یہ بات فراموش کرا دیتا ہے کہ اسے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے جس کے نتیجے میں یا ابدی راحت ہے یا بدترین عذاب۔ وہ انسان کو نقد منافع کا دھوکا دیتا ہے اور انسان ہے کہ اس کے دھوکے میں آ جاتا ہے۔ اس کا دھوکہ یہ بھی ہے کہ اے انسان! تُو جو چاہے کر‘ اللہ تعالیٰ بخش دے گا۔ قرآن مجید میں شیطان کے دھوکے سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَا یَغُرَّنَّکُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ ﴿۳۳﴾﴾ (لقمان) ’’وہ بڑا دھوکے باز تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکے میں نہ ڈالے۔‘‘

انسان لوگوں کے مال چراتا اور حقوق تلف کرتا ہے‘ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ کے حضور اسے پیش ہونا ہے جہاں اسے رشوت اور بددیانتی سے کمایا ہوا پیسہ واپس کرنا ہوگا۔ وہاں کسی کے پاس مال و دولت تو نہ ہوگی‘ کیونکہ ہر شخص دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے‘ لہٰذا اسے ظلم سے لوٹے ہوئے مال کے بدلے اپنی نیکیاں دینی ہوں گی۔ اگر لوٹا ہوا مال اور دوسری حق تلفیاں بہت زیادہ ہوں گی تو اس آدمی پر مظلوموں کے گناہ لاد دیے جائیں گے اور اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟‘‘ صحابہؓ نے عرض کیا:

ہم میں تو مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ پیسہ ہو اور نہ مال و اسباب۔ آپؐ نے فرمایا: ’’میری اُمت میں (سے قیامت کے روز) مفلس وہ ہوگا جو قیامت کے روز نماز‘ روزہ اور زکوٰۃ (ہر قسم کی عبادات لے کر آئے گا) اور ساتھ ہی کسی کو گالی دی ہوگی‘ کسی پر تہمت لگائی ہوگی‘ کسی کا مال کھایا ہوگا‘ کسی کا ناحق خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا (یہ سب گناہ لے کر آئے گا) تو مظلوموں کو بدلے میں اس کی نیکیاں عطا کی جائیں گی۔ پھر جب نیکیاں ختم ہو جائیں گی ان حقوق کی ادائیگی سے پہلے جو اس پر واجب ہیں تو مظلوموں کی خطائیں اور برائیاں اس پر ڈال دی جائیں گی اور پھر اس کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔‘‘ (مسلم)

قیامت کے حساب کتاب کی یہ ایک جھلک ہے۔ اگر انسان اس لمحے کو یاد رکھے تو کبھی کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرے اور حقوق العباد کے معاملے میں انتہائی محتاط ہو جائے کہ ہر چھوٹے بڑے حق کے بدلے میں نیکیاں دینی پڑیں گی اور اگر نیکیاں ختم ہو گئیں تو دوسروں کے گناہ اپنے سر لینے پڑیں گے۔ یہ تو اس کا حال ہے جس کے پاس نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت میں نیکیاں ہوں گی‘ تو اس شخص کا کیا حال ہوگا جس کے پاس نماز روزے کی صورت میں نیکیاں نہ ہوں گی‘ بلکہ اس نے تمام زندگی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی میں گزاری ہوگی۔ کتنے ہی مسلمان ایسے ہیں جو نماز جیسے فرض سے غافل ہیں اور زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ اور کتنے ہی ایسے ہیں جو بلاخوف وخطر چوریاں کر رہے ہیں‘ ڈاکے ڈال رہے ہیں‘ رشوت لے رہے ہیں‘ دھوکے جھوٹ اور ملاوٹ کے ذریعے حرام کمائی کھا رہے ہیں۔

یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ ہر ایک نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور موت کے ساتھ ہی دارالعمل کا وقفہ ختم ہو جائے گا اور دارالجزاء کا وقت شروع ہو جائے گا۔ جب انسان کو قبر میں ڈالا جائے گا تو اسی وقت سوال جواب شروع ہو جائیں گے۔ نیک آدمی کے لیے قبر کا گڑھا راحت اور آرام کی جگہ بن جاتا ہے اور ظالم کی قبر عذاب کی جگہ بن جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے‘ پس اگر کوئی اس سے نجات پا گیا تو اس کے بعد کی منزلیں اس سے زیادہ آسان ہوں گی‘ اور اگر کوئی اس سے نجات نہ پا سکا تو اس کے بعد کی منزلیں اس سے زیادہ سخت ہوں گی۔ جتنے بھی ہولناک منظر میں نے دیکھے ہیں قبر ان میں سب سے زیادہ ہولناک ہے۔‘‘ (ابن ماجہ)

حضور ﷺ صحابہؓ کے ساتھ ایک جنازے میں تھے۔ حضور ﷺ ایک قبر کے کنارے بیٹھ گئے اور رونے لگے۔ یہاں تک کہ (آپؐ کے آنسوؤں سے) مٹی گیلی ہوگئی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''اے میرے بھائیو! اس منزل کے لیے تیاری کرو۔'' (ابن ماجہ)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے غلام ہانی کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تو اتنا روتے کہ آنسوؤں سے آپ کی داڑھی تر ہوجاتی۔ ان سے پوچھا گیا کہ جب جنت اور دوزخ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آپ اتنا نہیں روتے' جتنا قبر پر کھڑے ہوکر روتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((إِنَّ الْقَبْرَ أَوَّلُ مَنْزِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الْآخِرَةِ، فَإِنْ نَجَا مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَيْسَرُ مِنْهُ، وَإِنْ لَمْ يَنْجُ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَشَدُّ مِنْهُ)) (رواہ الترمذی و ابن ماجہ و احمد)

''قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے۔ اگر انسان اس میں نجات پا گیا تو بعد میں آنے والی منزلیں اس سے زیادہ آسان ہوں گی۔ اور اگر وہ اس میں نجات نہ پاسکا تو بعد میں آنے والی منزلیں اس سے زیادہ سخت ہوں گی۔''

کسی شخص کو معلوم نہیں کہ اس کی زندگی ختم ہونے میں کتنا وقت باقی ہے' چند سال' چند مہینے' چند ہفتے' چند دن یا چند لمحے۔ موت آئے گی تو مہلت کا یہ وقت ساتھ ہی ختم ہوجائے گا۔ اب نہ وہ اپنے گناہوں کی تلافی کر سکے گا اور نہ ہی اُسے نیک کام کرنے کا وقت دیا جائے گا' بلکہ وہ اگلی زندگی میں داخل ہو چکا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کو اپنی زندگی کے ہر لمحے کو غنیمت جان کر بُرائیوں سے بچ کر گزارنا چاہیے اور بھلائی کے کاموں میں چستی کے ساتھ مشغول ہوجانا چاہیے تاکہ انجام کار وہ کامیاب ہوسکے۔

الغرض! ہر شخص کو چاہیے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی خوفِ خدا کے ساتھ پابندی کرے۔ حق داروں کا حق ادا کرے۔ معصیت کے کاموں سے بچے' کثرت کے ساتھ استغفار کرتا رہے۔ زبان کو ہر وقت کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ تر رکھے' تاکہ مرتے وقت یہی الفاظ اس کی زبان پر ہوں۔ امید واثق ہے کہ جس شخص نے ان الفاظ کے ساتھ وفات پائی وہ جنّت میں جائے گا۔

❁❁❁

Sep. 2022
Vol.71
Regd. CPL No. 115
No.9
Monthly Meesaq Lahore